اقبالیات

اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر کشمیر

اقبالیات

12

مرتبہ

ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی سری نگر

© اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی

تاریخِ اشاعت ـــــ مارچ سنہ ۲۰۰۰ء

تعداد ـــــ پانچ سو

قیمت ـــــ چالیس روپے

کتابت ـــــ محمد یعقوب

مطبع ـــــ شالیمار آرٹ پریس سری نگر

اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی سری نگر

ترتیب

اداریہ _____ 5

فکرِ اقبال کی تخلیقی بازیافت ____ پروفیسر حامدی کاشمیری 7

اقبال اور ہیومنزم _____ ڈاکٹر قدوس جاوید 15

گُلے زخیابان جنتِ کشمیر _____ ڈاکٹر بشیر احمد نحوی 25

بانگ درا میں مشاہیر پر نظمیں ____ ڈاکٹر تسکینہ فاضل 32

اقبال کی فطرت نگاری _____ ڈاکٹر صورت جہاں 49

تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کا تعارف ۔ مشتاق احمد گنائی ریسرچ سکالر اقبال انسٹی ٹیوٹ 66

کلام اقبال کے چند اعلام و مشاہیر ____ سید شبیر احمد ریسرچ سکالر اقبال انسٹی ٹیوٹ 82

گوشۂ غزل — طرحی —

غزل ——— پروفیسر حامدی کاشمیری 105

غزل ——— حکیم منظور 106

غزل ——— مشعل سُلطان پوری 108

غزل ——— اسداللّٰہ آفاقی 109

غزل ——— غلام نبی ناظر 110

غزل ——— رخسانہ جبین 111

غزل ——— نذیر آزاد 112

غزل ——— محمد یاسین ساگر 113

غزل ——— محمد عبداللّٰہ منتظر 114

غزل ——— مشتاق کاشمیری 115

اداریہ

"اقبالیات" کا بارہواں شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ اس سال نامے کے ذریعے ہم فکرِ اقبال سے وابستہ ان چراغوں کی روشنی اور گرمی کی ترسیل کرتے ہیں جو نہ ختم ہونے والی اور نہ ہی مدھم پڑنے والی روشنی ہے۔ اقبال ہماری علمی، فکری اور روحانی سرگرمیوں کا وہ طاقت ور مرکز ہے، جس کے ساتھ بے شمار لوگوں کی عقیدت بھی ہے اور وابستگی بھی۔ جدید شعرا میں اقبال مشرق و مغرب کا سنگم ہے۔ ان کے ہاں انسانیت اور انسان دوستی کی وہ ساری قدریں ملتی ہیں، جن قدروں کی کمی، قلت اور فقدان سے موجودہ ادب محروم نظر آرہا ہے۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ فکرِ اقبال کی ترویج و اشاعت کے فرضِ منصبی پر یوں تو مامور ہے ہی، لیکن اقبال سے وابستہ جتنے بھی مکتبہ ہائے فکر اور مطالعات ہیں

ان سب پر جامع علمی و تحقیقی عمل سرانجام دینا بھی اس کے دائرہ کار میں شامل ہے، سیمیناروں سے لیکچر تقریری مذاکروں کے مقابلوں تک جتنے بھی ادبی، علمی، تعلیمی اور تحقیقی مشاغل ہیں، ان کے ساتھ ادیبوں، محققوں، شاعروں اور اقبال شناسوں کو جوڑنا ہمارا پختہ ارادہ ہے۔ ادیبوں کی مالی معاونت، ان کے لیے وظائف، ان کے رشحاتِ قلم کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنا، ان کی علمی سرگرمیوں کو مزید فعال اور منفعت بخش بنانا ہمارے مستقبل کے منصوبوں میں شامل ہے۔ ہم سالانہ

"اقبال ایوارڈ" کے ذریعے مستند ماہرینِ اقبالیات کی عزت افزائی کے سلسلے میں طریقۂ کار وضع کر رہے ہیں۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کو ملک کی اردو اکادمیوں اور ادبی اداروں سے منسلک کرنا اور ایک مشترکہ پروگرام کے ساتھ علمی و ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع کرنا ہماری ترجیحات میں شامل ہے۔ اقبال کے انگریزی خطبات پر عالمانہ تحقیقی کام انجام دینا اور اقبال کے اردو اور فارسی کلام کا ایک خوب صورت انتخاب منظرِ عام پر لانا ہماری کوششوں میں شامل ہے۔

"اقبالیات" کا زیرِ نظر شمارہ دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ حصّہ اوّل میں چند مقالات ہیں جو اقبال اور ہیومنزم سے لیکر اقبال کے اعلام و مشاہیر جیسے موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہے معروف ادیبوں کے ساتھ نئی نسل سے وابستہ اقبال شناسوں کی تحقیقی کاوشوں کو اس حصّے میں جگہ دی گئی ہے، تاکہ نَو وارد ادبأ کے جذبات و احساسات کی قدر اور بھرپور حوصلہ افزائی ہو۔ حصّہ دوم اُس طرحی مشاعرے پر مشتمل ہے جو ۹، نومبر ۱۹۹۸ء کو اقبال انسٹی ٹیوٹ کے اہتمام سے منعقد کیا گیا تھا اور جس کے لیے کلامِ اقبال سے دو مصرعۂ طرح چن لیے گئے تھے۔

ع ــــ چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

ع ــــ احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

"اقبالیات" کا یہ شمارہ انسٹی ٹیوٹ کی ادبی سرگرمیوں کی تصاویر سے بھی آراستہ ہے، جو مختلف تقاریب پر کھینچی گئی ہیں۔

حال ہی میں یونیورسٹی نے پروفیسر محمد امین اندرابی کو ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد اقبال انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت پروفیسر ایک سال کے لیے Re-employ کیا ہے جو ایک خوش آئند قدم ہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کو بامعنیٰ متحرک اور فعّال بنانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ اقبال کے پیغام کا ابلاغ اس کے صحیح تناظر میں ہو۔

ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

پروفیسر حامدی کاشمیری

فکرِ اقبالؔ کی تخلیقی بازیافت

اقبال اردو کے ایک عہد ساز شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم المرتبت مفکر بھی ہیں، شعر اور فلسفہ کے نقطۂ اشتراک اور پھر اقبال کے یہاں اس کی نشاندہی کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ فلسفہ کے ڈسپلن سے علمی طور پر وابستہ ہونے کی بنا پر اپنے طبعی اقتضا کے زیر اثر شعر سے فکر و فلسفہ کی طرف آئے، اقبال نے اپنے ذہنی عمل کا آغاز شاعری سے کیا، اور جس زمانے میں انہوں نے شاعری شروع کی، نظمیہ روایت کے توسیعی عمل کے باوجود داغ کا طوطی بول رہا تھا۔ اور اقبال نے داغ کے طرز کی ہی پیروی کی۔ چنانچہ بانگ درا کی ابتدائی غزلیہ شاعری پر روایت کے اثرات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اور نظمیں فطرت، ثقافت اور معاشرت کے حوالے سے موضوعاتی شاعری کے ذیل میں آتی ہیں۔ گویا اقبال نے شروع میں ایک پروردہ روایت شاعر کی طرح جذبہ و احساس سے انگیخت ہونے والی شاعری سے رشتہ جوڑا، وہ اگر اسی پر قایم رہتے تو فکری پیش رفت تو درکنار زیادہ سے زیادہ روایتی شاعری کے توسیع کاروں میں شامل ہو جاتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، اور بہت جلد ان پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ محض شخصی جذباتی، جمالیاتی اور تاثراتی کوائف کی تجسیم کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ دل وجود میں اثر کے انکشافِ حقیقت کی فکری طلب

کے تحت ایک منفرد اور ارفع مقصد کی تکمیل کے پابند ہیں :

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

ان کی ابتدائی دور کی شاعری میں بھی بعض مقامات پر انہوں نے خارجی اشیاء و مظاہر کو روایتی طور پر بھولنے کے بجائے استفہامیہ رویے کا اظہار کیا ہے اور اپنے اندر ایک مفکر کی موجودگی کا کسی قدر احساس دلایا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ یورپ گئے۔ انہوں نے اپنے تین سالہ قیام کے دوران مغرب میں مادی اور مشینی تہذیب کے مظاہر و احوال کے ساتھ ساتھ مغربی فلسفے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ انہوں نے اسی پر بس نہ کیا، بلکہ اسلامی فکر کے تاریخی ارتقاء اور اس کی نوعیت و معنویت کا بھی تجزیاتی مطالعہ کیا، اور اپنے نتائج فکر کو "اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید" میں پیش کیا۔ انہوں نے ساتھ ہی متصوفانہ فکر کو بھی تنقیدی نظر سے دیکھا۔ اور حیات و کائنات کے بارے میں سائنسی نظریات کا بھی جائزہ لیا، یہاں تک کہ بانگ درا میں جو فلسفی کہیں کہیں پر اپنے ہونے کا احساس دلاتا تھا۔ وہ بعد کی شاعری میں پورے جلال و جمال کے ساتھ سامنے آیا۔ اور اپنی مفکرانہ حیثیت منوانے میں کامیاب ہوا۔

اپنے مفکرانہ وجود سے آگاہ ہو کر انہوں نے اپنے لیے ارفع تر مقاصد کا تعین کیا وہ مروجہ روحانی اور سماجی تصورات سے کنارہ کش ہو کر سنجیدہ اور پیچیدہ فکری مسایل سے متصادم ہوئے اور بہت جلد موجودہ صدی کی ایک نئی تابناک اور توانا آواز بن گئے۔ انہیں خود احساس تھا کہ وہ عالم انسانیت کے لیے ایک عظیم اور رفیع مقصد لے کر آئے ہیں، اسی لیے انہوں نے یہ کہنے میں تامل نہیں کیا کہ وہ شاعری کے بجائے مقصدیت کے علمبردار ہیں۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اگر اقبال کے اس شعر سے واقعتاً اور بالقصد یہ مراد لیا جائے کہ وہ شاعری کو قطعی طور پر ایک مفید مقصد کی ترسیلیت کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ تو ان کی مقصدیت سے قطع نظر، شاعری یقیناً اپنے وجود اور جواز سے محروم ہو جائے گی۔ فوری طور پر ان کی شعر بیزاری یا شعر سے منحرف ہونے کا رویہ ان کے تعجب انگیز طریقے سے تمام عمر شعر سے پیوستہ رہنے کی بنا پر اور اپنے مقصدی خیالات کو بالخصوص شعر ہی کے وسیلے سے پیش کرنے سے ایک متضاد صورت حال جنم لیتی ہے جس کی کوئی معقول توجیہہ نہیں کی گئی ہے، اور نہ ہی اقبال نے اس ضمن میں کسی توضیح سے کام لیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اقبال دراصل شاعری سے بے اعتنائی برتنے کے رویے کا اظہار کرتے ہوئے روایتی اور مروجہ شاعری سے اپنے ذہنی بُعد کی جانب اشارہ کرتے ہیں روایتی شاعری انیسویں صدی سے ہی روایت زدگی کی بنا پر اپنی عدم معنویت کا احساس دلا چکی تھی، جیسا کہ مولانا حالی کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے، اقبال اس سے بخوبی واقف تھے اس لیے انہوں نے اس نوع کی شاعری سے منحرف ہونے کا اقدام کیا۔

او حدیثِ دلبری خواہد زمن
آب و رنگِ شاعری خواہد زمن
کم نظر بے تابیٔ جانم نہ دید
آشکارا دید و پنہانم نہ دید

واضح رہے کہ وہ قوموں کی زندگی میں فنونِ لطیفہ اور بالخصوص شاعری کی قدر و قیمت سے آگاہ تھے۔

رنگ ہو یا خشت سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

وہ متردد تھے تو اس بات سے کہ شاعری صحیح معنوں میں شاعر کے تخلیقی وجود کے اظہار

کا موثر وسیلہ بننے سے محترز تھی' لہذا اس نوع کی شاعری سے منحرف ہونے کے باوجود انہوں نے شاعری سے انقطاع نہیں کیا۔ اور اسے اپنی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ بنایا'

قبل اس کے کہ یہ دیکھا جائے کہ انہوں نے کس شعری وسیلے کو کام میں لاکر اپنی مفکرانہ بصیرت کی لفظی صورت گری کی' یا شعر اور فلسفہ کا لفظ اشتراک کیا ہے' یہ دیکھنا لازمی ہے کہ اُن کی فکر کی نوعیت اور اس کے امکانات کیا ہیں۔ اقبال ذہنی تشکیل کے ابتدائی دور سے نکل کر اپنی ذہنی بلوغت کے دوران تاریخی' معاشرتی' ثقافتی اور سیاسی مسایل سے نبرد آزما ہونے کے ساتھ ساتھ بعض ماورائی مسایل مثلاً حیات' کاینات' موت' خدا' زمان و مکان' خودی' عشق اور حرکیت کا شخصیت کی پوری توانائی اور آگہی کا سامنا کرتے رہے' ماورائی مسایل سے متعارض ہونے کی طلب' خواہش اور تحسس اُن کی فطرت ثانیہ تھی' چنانچہ انہوں نے خطبات میں شرح وبسط کے ساتھ مذہب' خدا' انسانی انا اور تحرک پر استدلالی اور متجسسانہ نظر ڈالی انہوں نے فکر قرآنی اور مسلکِ رومی کے پس منظر میں مشرق اور مغرب کے فلسفیانہ نظریات کا مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ روئے زمین پر انسان اشرف المخلوقیت کے مرتبے پر فایز ہونے کی بدولت اپنی ذہنی اور فکری قوتوں سے کام لے کر کاناتی قوتوں کو مسخر کرسکتا ہے' اور پھر ایک فلاحی اور انسانیت نواز معاشرے کی تشکیل کرسکتا ہے' یہ انسان کے اپنے وجود کاینات اور خدا کے باہمی رشتوں کے ادراک وغیرہ ان کا عمل ہے۔

صورت گری را از من بیاموز
شاید کہ خود را باز آفرینی

اقبال نے اس فکری عمل کو بامعنی اور بارور بنانے کے لیے انسان کی اصل پر تفکر کیا۔ ان پر یہ بات کھل گئی کہ انسان کاینات کا ایک حصہ ہونے کے باوجود' اور کاینناتی خواص سے متصف ہونے کے باوجود کاینات سے الگ اپنے وجود کا اثبات کرتے' اور کاینات پر حاوی ہونے اور اسے اپنے مصرف میں لانے کی خداداد صلاحیت سے بہرہ مند ہے' وہ کاینات

کے مقابل کائنات اصغر کا درجہ رکھتا ہے، انسان کی کائنات سے رشتگی کی بنا پر انہوں نے کائنات کی اصل کی طرف بھی رجوع کیا۔ اور مابعد الطبیعاتی سطح پر زمان و مکان جو کائنات کی بنیادی حقیقت ہے۔ کا ادراک کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔

ان کے نظریے کے مطابق زماں ایک زندہ حرکی اور بیکراں قوت ہے۔ جو دائمی تحرک سے متصف ہے اور وقت کے روایتی تصور یعنی روز و شب اور مادہ و سال کی گردش سے ماورا ہے انسان وقت کے ابدی بہاؤ کا ناظر نہیں، بلکہ وقت کے اندر ہے اور وقت کے اندر رہ کر اپنی خود آگہی کی بدولت وقت کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کی حرکت پذیری سے آشنا ہے۔ اقبال نے لکھا ہے "انسانی انا کی ابتدا زماں میں ہوئی ہے، اور زمان و مکاں کے تانے بانے میں ہونے سے پہلے وہ موجود نہیں ہوتا"۔ اقبال پر یہ راز منکشف ہوا کہ زمان کی طرح مکاں بھی دائمی حرکت، تغیر اور توسیع کا پابند ہے:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

لازماً انسان بھی دائمی حرکت کا پابند ہے۔ یہ انکشاف انہیں اپنے وجود کی آگہی سے ہوا اور اسلامی فکر نے اس کی توثیق کی، یہیں سے اقبال کے تصور خودی، جو اُن کے شعور زماں کا حاصل ہے، کی تشکیل ہوتی ہے، وہ زماں اور زماں کے خالق یعنی باری تعالیٰ کو ایک حد درجہ فعال، حرکی اور عدیم النظیر قوت کے طور پر دیکھتے ہیں، اور انسان کو ارض اللہ پر خدا کے نائب کے طور پر دیکھ کر اس کے حرکی ہونے کی توثیق کرتے ہیں،

وہ انسان کو حرکت، قوت اور انقلاب کی زندہ تجسیم قرار دیتے ہیں، اس فکری بصیرت کی روشنی میں جب وہ عالم انسانیت اور خاص کر ملت اسلامیہ کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں، تو انہیں یہ دیکھ کر دلی رنج ہوتا ہے کہ انسان نے نیابتِ

الٰہی کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر مجہولیت، بے عملی، سُکر کاہلی اور تقدیر پرستی کو اپنا شعار بنایا ہے اور نتیجے میں وہ افلاطونی طاقتوں کا غلام بن کر رہ گیا ہے، انہوں نے مسلمانوں کی سکوتی حالت کا سبب اور افلاطونی فلسفے اور وحدت الوجودی نظریے کو بھی قرار دیا ہے جس کی رُو سے انساں حقیقت ازلی کا محض سایہ بن کر رہ جاتا ہے۔

اقبال نے نئے دور کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے انسان کو خواب غفلت سے جگانے اور اسے اپنی قوتوں سے آگاہ کرنے کا بیڑا اٹھایا، ان کے خیال میں انسان عزم و عمل سے فطرت پر حاوی ہو سکتا ہے اور تقدیر سازی کر سکتا ہے، یہ گویا زندگی کو مقصد آفرینی کے مماثل بنانے کا عمل ہے، اقبال کی فکر میں مقصد آفرینی جس سے دیگر مخلوقات محروم ہیں، کو اہم حیثیت حاصل ہے، اور یہ ایک بے پایاں جذبے، جسے وہ عشق سے موسوم کرتے ہیں، سے منسوب ہے، عشق غیر خود سے ٹکرانے کی ترغیب دیتا ہے اور "معرکہ بدر و حنین" میں بدل جاتا ہے، ظاہر ہے عشق ایک ارفع تر تصور پر حاوی ہے۔

عشق دم جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

یہ عشق ہے جو ہنگامہ ہا تعمیر کرتا ہے:

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزم خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے جامع تفکر کی شعری بازیافت کی ہے، اس معجزاتی عمل میں انہوں نے کوئی شعوری کاوش نہیں کی ہے، اور نہ ہی اپنے تصورات کو نظمانے کا غیر شعری طریقہ اختیار کیا، اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنے معاصر جوش کی سطح سے اوپر نہ اٹھتے، انہوں نے جیسا کہ بعض نقاد اُن کے شعری عمل کا دفاع کرتے ہوئے کہتے ہیں، فکر کو محسوس فکر بنا کر بھی پیش نہ

کیا۔ ایسی صورت میں شعری عمل اُن کی ارادی سعی کا تابع ہو کے رہ جاتا، انہیں ان شعری تھکنڈوں کو برتنے کی ضرورت ہی نہ تھی، ان کی شعری شخصیت تخلیقی سرجوش کی حامل تھی، لہذا انہوں نے جو شعری عمل روا رکھا وہ تمام و کمال تخلیقی نوعیت کا ہے۔ یہ شعری عمل ہر زمانے کی بڑی شاعری پر منطبق ہو سکتا ہے یعنی انہوں نے کسی سوچے سمجھے یا طے کردہ خیال یا نظریے کو نظم نہیں کہا، بلکہ اپنے کلی باطنی وجود کی بازیافت سے سروکار رکھا۔ ان کی داخلی شخصیت ایک خود آگاہ، جہاں بیں، جامع اور حرکی شخصیت ہے، یہ شخصیت حیات و کائنات کے ازلی مسایل کا شعور رکھتی ہے، اور بنی نوع انسان کے مقدر پر تفکر کرتی ہے۔ فکری رویہ اس شخصیت کا خاصہ ہے، بلکہ اس کی شناخت ہے، یہ ان کو "درد و سوز و آرزومندی" سے آشنا کرتا ہے۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر، مے گردد چو سوز از دل گرفت

تفکری رویے کا "سوز و ساز" میں بدلنا اقبال کے شعری عمل کا وصف ہے۔ اسی سے "دل کوہ و دشت و صحرا" گداز ہوتا ہے، اور شعری صورت حال کی تخلیق ہوتی ہے۔

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دلِ کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن

اقبال کی شاعری میں جو کردار ابھرتا ہے، وہ دانائے راز ہے، اور رازہائے حیات کا انکشاف کرتا ہے، یہ اس لیے ممکن ہوا ہے کہ اقبال کی شعری حسیت کے لیے فکر و فلسفہ "ارتباطِ جان و تن" کی مثال ہے، اس کا عملی ثبوت وہ شعری کردار پیش کرتا ہے۔ جو ایک ہزار شیوہ مرد قلندر کی طرح ان کے کلام میں اُن کی جگہ لے لیتا ہے، اور اپنے یقین آفریں، پر سوز، متین اور تابناک لہجے میں مخاطب ہو کر ایک نادیدہ تخیلی صورت حال کو خلق کرتا ہے، اور ایک نگاہ سے تقدیریں بدل دیتا ہے، یہ کام استعارہ کاری اور دیگر شعری وسایل سے زیادہ شعر

کے آہنگ اور شعری کردار کے وقار، ہمہ گیری اور سوز نفس سے انجام پاتا ہے، اور اردو شاعری میں فکری تخلیقیت کا ایک نیا اور روشن باب کھل جاتا ہے۔

پس از من شعرِ خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد ایک مرد خود آگاہے

★

ڈاکٹر قدوس جاوید

اِقبالؔ اور ہیومنزم

ہیومنزم ــــ معنیاتی توضیح و تعبیر کے حوالے سے، جس قدر سادہ اور عام فہم اصطلاح ہے اطلاقی حدود و امکانات کے تعلق سے اتنی ہی تہہ دار اور پیچیدہ بھی ــــ سبب یہ ہے کہ آج عالمی سطح پر ــــ انسانی معاشروں کے ہمہ جہت ارتقائی عمل کے ساتھ ساتھ قدیم مستند اور آشنا ثقافتوں کے زوال ــــ اور نئی ذیلی اور غیر مانوس ثقافتوں کے عروج کا عمل بھی یکساں رفتار سے جاری ہے۔ نتیجتاً انفارمیشن ٹکنالوجی اور گلوبلائزیشن کے حوالے سے دنیا کا ہر بڑا اور چھوٹا انسانی معاشرہ۔ کم یا زیادہ پرانی قدروں کی شکست و ریخت اور نئی قدروں کی تشکیل کے حیران کن مرحلوں سے گذرتا ہوا فعالیت MOBILITY کی اس منزل پر پہنچا ہے جہاں ایک نئی صارفینی تہذیب CONSUMER'S CULTURE زندگی کے تمام شعبوں میں نفع اور نقصان کے عنوان سے انسان اور انسانیت کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ دو عظیم جنگوں کی تباہ کاریوں صنعتیت INDUSTRCALISATION اور سرمایہ داریت CAPITALISM کے تضادات کے بطن سے پیدا ہوتے والی اس نئی ثقافتی

صورت حال کو ٹوائن بی سے لے لے جیمس JAMESON اور ہیرمس تک اور لیوتار سے بیکر اجب حسن، لینری فیڈلر اور ایڈورڈ سعید تک نے مابعد جدید ثقافتی صورت حال POST MODERN CULTURAL CONDITION کہا ہے یہ پوسٹ ماڈرن صورت حال ایک طرف جہاں انسان کے تمام آزمودہ نظریات و تصورات کی کلیت پسندی، وحدانیت اور مرکزیت کے آگے سوالیہ نشان لگا رہی ہے، وہیں دوسری جانب کثرتیت PLURALISM تنوع، لامرکزیت DECENTRALISATION اور امتیازیت DIFERENTIATION کو عروج بھی بخش رہی ہے لیکن ہیومنزم کے حوالے سے یہ نئی تہذیب انسان اور انسانیت کے لیے باعث رحمت نہیں باعث زحمت ہی ثابت ہو رہی ہے کیونکہ یہ نئی تہذیب مختلف عوامل کی مدد سے ایسے انسان کی تخلیق کر رہی ہے جو ہیمنگوے کے الفاظ میں لڑنے مارنے والا شہوانی حیوان LUSTING, FIGHTING, KILLING ANIMAL ہے۔ اس ہیبت ناک حقیقت کے سبب ہیومنزم کے منفی مفہوم کو عروج حاصل ہوا ہے یعنی ہیومنزم ایک ایسے نظام فکر کے طور پر سامنے آیا ہے جس میں انسانی وجود کو تمام تر اخلاقی تاریخی سماجی اور ایمانی پابندیوں سے بالاتر سمجھا جا رہا ہے۔ اسی لیے آج دنیا کے تمام انسانی معاشرے "احساس مرگ" کے ایک ناقابل برداشت بوجھ کے نیچے دب گئے ہیں۔ انسان۔ حیوان کی صورت زندہ تو ہے لیکن تمام تر ذہنی فکری علمی اور سائنسی ارتقا کے باوجود انسان اور انسانیت یعنی ہیومنزم کے سرچشموں اور حوالوں کو مردہ تصور کر رہا ہے نطشے نے تو انیسویں صدی میں ہی خدا کی موت کا اعلان کر دیا تھا، بیسویں صدی میں فوکیاما نے "تاریخ کا خاتمہ" کے نام سے کتاب لکھ کر انسان کو بے جڑ کا پودا ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، رولاں بارتھ نے مصنف کی موت کی بات کہی تھی الون کرنن نے ادب کی موت کا فتوی صادر کیا اور ان سب سے ایک قدم آگے بڑھ کر ڈینیل بیل نے ہیومنزم

سمیت انسان اور انسانیت کی فلاح و بہبود سے متعلق تمام نظریات و تصورات کی موت کا اعلان کر دیا۔ گویا بقول اقبال :

توڑ ڈالیں فطرت انسان نے زنجیریں تمام

دراصل آج کی تہذیبی صورت حال ہیومنزم کے لیے جس قدر منافی ہے اسی قدر ہیومنزم کی متقاضی بھی ہے۔ آج انسانی زندگی اس درجہ PROBLEMATIC ہوگئی ہے کہ ہر انسان اپنے افکار، میلانات اور ضروریات کے اعتبار سے الجھن اور انتشار کا شکار ہو کر رہ گیا ہے انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں ایسے عناصر بہت کم ملتے ہیں جو ہیومنزم یا انسانی زندگی کی صحیح معنویت، مفہوم اور توانائیوں کی جانب اشارہ کریں ورنہ عام طور پر انسان اور انسانیت بحران انتشار اور پراگندگی میں ہی مبتلا ہے۔ چنانچہ اس صورت حال میں ثقافت اور سماجیات ہی نہیں ادب کے حوالے سے بھی یہ سوال اہمیت حاصل کرتا جا رہا ہے کہ آج کے سماجی و ثقافتی تناظر میں ہیومنزم کی تعریف کیا ہے اور معنویت کیا ہے۔؟ چنانچہ عصر حاضر میں ہر نوع کے فکر و فلسفہ کی لکیریں کہیں نہ کہیں سے ہیومنزم کو ضرور مس کر رہی ہیں۔ مثلاً فنون لطیفہ کے حوالے سے پیلوفسکی PANOYSKY آلڈوروسی ALDOROSSI مائکل گریوس MICHAEL GRAVES پیٹر آیزن مین PETEREISENMAN اور لیوس مفورڈ LEWISMUM-FORD سے لے کر البرٹی ALBERTI اراسمس ERASMUS اور گروشیس GROTIUS تک نے ہیومنزم کی اصطلاح کا مفہوم "انسان کی وجودی افضلیت" قرار دیا ہے۔ لیکن پیچیدگی اس وقت پیدا ہوئی جب بعض دانشوروں نے ہیومنزم کا مطلب "عیسائی خدا میں انسان کی وجودی افضلت ONTOLOGICAL PRIMACY OF MAN OVER CHRISTIAN GOD قرار دیا — انسان — وجود برحق

کا جزو محض ہے یا انسان خود اپنا ایک الگ آزاد وجود رکھتا ہے۔ یہ بحث عیسائیت کے حوالے سے یونان میں چوتھی صدی عیسوی کے اخیر میں ہی شروع ہوگئی تھی جب عیسائیوں کو ان کے عقاید کے مطابق پاگان دور یعنی دور جاہلیت سے تمیز کرنے کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ اور جس کے تحت ہیومنزم کے موضوع پر غور و فکر کا آغاز ہوا تھا۔ بیسویں صدی کے کئی فلاسفہ نے ہیومنزم پر اظہار خیال کرتے ہوئے چوتھی پانچویں صدی کی ان بحثوں کو ناگزیر حوالہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ انسانی وجود سے متعلق یہ بحث اسلامی تصوف میں وحدت الشہود اور وحدت الوجود کے عنوان سے کس شکل میں سامنے آتی ہے یہ ایک الگ بحث ہے۔ ویسے خالص ہیومنزم کے تصور کے معنی و مفہوم اور ابتدا و ارتقا کی گہرائیوں میں اتریں تو اسلامی تصوف کی رو سے بایزید بسطامی کی تفصیلی وضاحتوں سے لے کر تیسری صدی ہجری میں شریعت اور طریقت کی ثنویت اور منصور بن حلاج کے حوالے سے عطار کے "تذکرۃ الاولیا" اور جامی کے "نفحۃ الانس" امام غزالی کے مشکوٰۃ الانوار اور ابن عربی وغیرہ کی روایتوں اور وضاحتوں تک سے بحث کرنی ہوگی۔ ویسے، ہیومنزم کی بحث تصوف کے دائروں کو جس حد تک بھی مس کرے یہ بات طے ہے کہ مغربی فلاسفہ کے یہاں انسان کی عظمت کا ہر تصور انسانی وجود کے وجود برحق میں ضم ہو جانے کی لذت کے تصور سے خالی ہے۔ مغرب میں ہیومنزم سے مراد وہ نظام فکر ہے جس میں انسانی اور دنیاوی مفادات حاوی ہوتے ہیں۔ چنانچہ نشاۃ الثانیہ کے بعد اور پھر اٹھارہویں صدی میں روشن خیال فلسفیانہ منصوبہ ارتقا ENLIGHTENMENT PHILOSOPHYCAL PROJECT OF DEVELOPMIENT اور انسویں صدی کی جوابی روشن خیالی کے تحت بھی جب معاشرہ میں بحیثیت انسان فرد کی اہمیت اور معنویت قایم کرنے کا سوال اٹھایا گیا تو اس کے پس پشت بھی دراصل

ہیومنزم کا یہی تصور کارفرما تھا کہ "ہیومنزم انسان کی وجودی افضلیت کے اقرار کا تصور ہے"۔ ہیومنزم کے حوالے سے روشن خیال منصوبہ ارتقاء کا نظریہ یہ تھا کہ معاشرہ میں کسی بھی انسان کی حیثیت بھیڑ میں شاملِ گمنام شخص کی نہ ہو بلکہ ایسے آزاد اور خود مختار SOVERCIGN وجود کی ہو جس کے اندر مخصوص و محدود اور روایتی و مقامی بنیادوں پر نہیں بلکہ وسیع لامحدود آفاقی تناظر میں اپنی ثقافت کے تئیں وفادار رہتے ہوئے ہر طرح کے سیاسی تمدنی اور سماجی تقاضے پوری کرنے کی بھرپور صلاحیت بھی ہو اور معاشرہ کی جانب سے فرد کو اس ضمن میں مساوی حقوق بھی حاصل ہوں۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں ہیومنزم کا یہ تصور برقرار رہتا ہے لیکن تجریدی صورت میں۔ یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ نشاۃ الثانیہ کے بعد سے بیسویں صدی کے اوائل بلکہ دوسری جنگ عظیم تک جو مختلف و متضاد سیاسی و سماجی، معاشی و تاریخی اور ادبی و ثقافتی نظریات تحریکات اور رجحانات سامنے آتے ہیں ان سب کے اثر سے انسان کی پہونچ کے دائرے میں آنے والے تمام شعبوں میں غور و فکر کے جتنے بھی نئے رویّے سامنے آتے ہیں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ان سب کا تعلق ہیومنزم سے ہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آج عالمی سطح پر زبان و ادب کے حوالے سے جس ساختیاتی فکر کا غلغلہ ہے اُسے بھی اسکالر لیش جیسے دانشور ہیومنزم سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ خود ساختیاتی فکر کے بانی مفکرین التھیوسے ALTHUSSER رولاں بارتھ R-BARTHES فوکالٹ FOUCAULT اور بوردیو BOURDIEU وغیرہ نے سارتر، مرلے پونٹی MERLEAU PONTY وغیرہ کے ادارہ مرکز AGENCY CENTRED سماجی نظریات کی تردید کرتے ہوئے اپنے ان پیش رو نظریہ سازوں کو ہیومنسٹ قرار دیا تھا۔ (لیکن جدیدیت اور

ہیومنزم کی مخالف ہے اور کون حامی اس کے بارے میں مختلف و متضاد خیالات ظاہر کئے جارہے ہیں)۔ لیکن ہیومنزم کے مفہوم اور ارتقاء کے اجمالی جائزے کے بعد اگر خالص ادبی نقطہ نظر سے جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہیومنزم کے حوالے سے ادیب دو گروہوں میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ادیبوں کا ایک گروہ یہ مانتا ہے کہ کوئی بھی ادیب یہ سوچ کر لکھنے نہیں بیٹھتا کہ اس وقت مجھے انسان اور انسانیت کی خدمت انجام دینی ہے یا اس کی تخلیقی سرگرمی کے نتایج انسان اور انسانیت کے لیے تعمیری ثابت ہوں گے یا تخریبی۔ تخلیقی لمحے میں اسے نتایج سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ـــــ لیکن وہ ادیب اور دانشور جو شعر و ادب کو محض سفلی جذبات کا اظہار یا لفظوں کا کھیل سمجھنے کے بجائے شعر و ادب کے تعمیری کردار پر یقین رکھتے ہیں وہ تخلیقی لمحے میں تخلیق کے نتایج سے بھی باخبر رہنے اور کسی بھی حالت میں انسان اور انسانیت کو فراموش نہ کرنے پر اصرار کرتے ہیں ـــ یوں بھی ایک سچا اور بڑا ادیب' اول تو یہ مانتا ہے کہ ادب انسان کی داخلی اور روحانی بصیرتوں کا وسیلہ تو ہے ہی خارجی حیات و کاینات کے تعمیری شعور کا ذریعہ بھی ہے اسی لیے ہر بڑا اور غیر معمولی فن کار جیسے کہ اقبال ـــ اور باتوں کے علاوہ سائنسی و مادی ارتقا کے ہاتھوں تہذیب و انسانیت کی ساری امکانی تباہیوں کے پیش نظر انسان کے لیے ایسے اخلاقی و روحانی انقلاب پر اصرار کرتا ہے جو ساری دنیا کو انسانیت دوستی یا ہیومنزم' ذہنی استحکام اور اخلاقی وحدت کے رشتے میں پرو سکے۔ اقبال کے کلام خطوط اور خطبات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اقبال ایک ایسا غیر معمولی شاعر اور دانشور ہے جو اپنی خاکستر میں نہ صرف اپنے زمانہ اور اپنے

معاشرہ کی زندگی کو حرکت کرتا ہوا محسوس کرتا ہے بلکہ جس کے اندر ماضی کے تمام اکتسابات اور فتوحات کی روح بھی سرگرم تھی۔ اقبال نے اپنی تحریروں میں اس امتیاز کا اظہار شعوری طور پر کیا ہے کیونکہ اقبال کو پتہ تھا کہ زندہ ماضی ہی وہ قوت ہے جو انسان کے حال کی عنصری ترکیب اور مستقبل کی تعمیری تخیل کے عمل کو انجام تک پہنچاتی ہے ـــــ چنانچہ اقبال کے عظیم افکار اور جدید شعری رویوں کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی فکر کا مرکز و محور انسان، انسانیت اور انسان دوستی یعنی ہیومنزم ہی ہے اور زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ فکر اقبال، اس غیر معمولی تاریخی، عمرانی ثقافتی اور فنی شعور HISTORICAL, SOCIO-CULTURAL AND ARTISTIC CONSCIOUSNESS سے عبارت ہے جو اقبال کے یہاں اسلامی ہندوستانی اور یوروپی نظریات حیات اور اقدار و روایات فن کے بصیرت مندانہ تجزیہ و تحلیل کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔ اور جس کا مقصد اول و آخر، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، تمام بنی نوع انسان کے لیے اس عالمگیر نظام تمدن UNIVERSAL CULTURAL SETUP کی تصدیق و توسیع ہے جو عہد حاضر کی کش مکش مسابقت اور انتشار میں صرف عالم اسلام ہی نہیں پورے عالم انسانیت کے لیے راہ نجات ہے۔ اور جس طرح اسلامی نظام تمدن میں اتنی لچک، وسعت اور تنوع ہے کہ یہ ہر زمانے ہر مقام اور ہر معاشرے کے لیے مثالی "دستور حیات" بن سکتا ہے اسی طرح اقبال کے فکر و فن میں بھی اتنی لچک وسعت اور تنوع ہے کہ کسی بھی زمانہ، معاشرہ اور زبان کی شاعری اور فکر و فن کے لیے رہنما فکری اور جمالیاتی اقدار فراہم کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس مخصوص زمانہ اور معاشرہ کے لوگ اپنی مخصوص زبان کی شاعری کو انسان اور انسانیت یعنی ہیومنزم

کے حوالے سے بامقصد تعمیری حیات افروز اور نتیجہ خیز فکری و جمالیاتی نظام کے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت کو شدت محسوس کرتے ہوں ـــ اور جیسا کہ ابھی کہا گیا اقبال کی شاعری کا مرکز و محور انسان کی عظمت و معنویت کا ہی ترانہ ہے جو ہیومنزم کے تصور کی بنیاد ہے۔ خون جگر سے نمو پانے والا یہ ترانہ ذوق یقین کے ساتھ شعریت کے تمام تر آداب برتتے ہوئے اس طرح اظہار پاتا ہے کہ "سل" مجسم "دل" بن جاتا ہے اور "صدا" "سوز و سرور" ـــ اس اعتبار سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کے تصور کی مثالی انسانیت EXEMPLARY HUMANITY ایک تو وہ ہے جس کے مظاہر عہد رسالت میں کثرت سے ملتے ہیں اور جس کے تحت مساوات و جمہوریت کی اعلیٰ ترین اقدار کے مکمل احترام کے طور پر (حضرت) بلال حبشیؓ جیسے ادنیٰ غلاموں کو سینکڑوں عظیم المرتبت مکی و مدنی سرداروں اور امیروں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور انسان ـــ اقبال کی فکری و جمالیاتی کائنات کا وہ مثالی انسان EXEMPLARY MAN ہے جو اپنی ذات میں شعلہ بھی ہے اور شبنم بھی ـــ جس میں جگر لالہ کو ٹھنڈک پہنچانے والا شبنمی جمال بھی ہے اور دریاؤں کے دل دہلانے والا طوفانی جلال بھی ـــ ایک لطیف اور دلاویز وحدت کی صورت۔ اقبال کی ہیومنزم اسی وحدت کی تلاش سے عبارت ہے، جو ہیومنزم کے منفی مفاہیم کی رد بھی ہے تخلیق بالحق اور تخلقو با اخلاق اللہ کی رو سے ہیومنزم کی تشکیل بھی ـــ تلاش کے اس عمل میں اقبال دنیا کے متعدد عظیم انسانوں سے ٹکراتا ہے کبھی ان کو اپنے روبرو کرتا ہے اور کبھی خود ان کے روبرو ہوتا ہے۔ ان میں فلاسفر دانشور، اوتار، غلام، بادشاہ، صوفی، قلندر، شاعر اور ادیب ہر طرح کے انسان شامل ہیں، مثلاً نطشے، گوئٹے، لانگ فیلو، افلاطون، اسپنوزا، کارل مارکس لینن، ابی سینا، محمد دالف ثانی، سوامی رام تیرتھ، شری رام، عطارؒ، رومیؒ، رازیؒ

غزالیؒ، ابوالعلی معری، غالب، صائب، خوشحال خان، جمال الدین افغانی، بوعلی قلندرؒ، نادر شاہ افغانی، سکندر، چنگیز خان، نوشیروان، طارق بن زیادؓ، فاروقؓ اور حضرت بلالؓ وغیرہ ــــ انسان، انسانیت اور انسان دوستی کی یہ تلاش ہی اقبال کو عصری سیاسی تہذیبی، عمرانی اور فنی حتی کہ مروجہ صوفیانہ اقدار تک کی نکتہ چینی پر مجبور کرتی ہے۔ کیونکہ یہ مروجہ اقدار انسان کی اجتماعی معنویت و عظمت کی نفی ہی کر رہی تھیں اثبات نہیں ـــ

انسان اور انسانیت کی معنویت اور بقا کا یہی جذبہ "جاوید نامہ" میں اقبال کو بازندہ رود پیر رومی کی رہنمائی میں مختلف افلاک کی سیر بھی کرواتا ہے۔ جہاں اقبال کا عارف ہندی (پاروتی کے شوہر، اردھ ناریشور، نٹ راج) شوجی مہاراج. بھرتری ہری، نطشے، کارل مارکس اور اسپنوزا سے لے کر امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانیؒ اور ٹیپو سلطان وغیرہ عظیم انسانوں سے مکالمہ ہوتا ہے۔ اس مکالمہ میں اقبال، مشرق و مغرب کا فلسفہ، تہذیب و تمدن، مذہب و ملت، وطنیت و قومیت، خلافت و ملوکیت، غلامی و آزادی، فقر و زہد، تقدیر و تدبیر حیات و کائنات وغیرہ سے متعلق جو وضاحتیں پیش کرتے ہیں وہ ایک طرف تو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ انسان کے لیے خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے وجود کو مثالی اور مکمل انسان کے سانچے میں ڈھالنا ناممکن نہیں۔ دوسری طرف یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کے ہیومنزم کے تصور کی بنیاد، موت کے خوف سے آزاد جہد مسلسل کا نظریہ ہے انسان کے ماضی حال اور مستقبل کو سامنے رکھ کر اقبال واضح لفظوں میں بتاتے ہیں کہ "زندگی تسلیم و رضا سے مستحکم ہوتی ہے۔ موت نیرنگ اور طلسم اور سیمیا کے سوا کچھ اور نہیں۔ زندگی اور موت کے اسی تصور سے مثالی انسان اور مثالی ہیومنزم کی تخلیق و تشکیل ہوتی ہے۔ مثالی انسان اور مثالی انسانیت کا یہ

تصور اقبال انسان کامل کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ انسان کامل ایک اعتبار سے اقبال کے مثالی انسان اور مثالی ہیومنزم کے لیے استعمال ہونے والی آخری اصطلاح ہے اس سے قبل اقبال مردِ خدا، بندہ حق، مردِ قلندر بندہ آزاد، مردِ مومن وغیرہ متعدد اصطلاحات کا استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہ گویا مثالی مکمل انسان کی تلاش کے مختلف مرحلے تھے۔ لیکن عالم ارضی سے لے کر عالم ارواح تک کے ذہنی و تصوراتی سیر کے بعد اقبال فکری و منطقی اعتبار سے بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زندگی کے تمام شعبوں میں انتشار و بحران کی شکار عالمی انسانی برادری کی نجات کی خاطر عالمگیر نظام تمدن کی تشکیل کے لیے جس انسان کامل کو رہنما بنایا جا سکتا ہے وہ رسول پاکؐ کے سوا اور کوئی نہیں ــــ اور رسول اللہ صلعم کے توسط سے انسانوں تک پہنچنے والے کلام الٰہی میں ہی مثالی انسان، انسانیت، انسان دوستی اور مثالی انسانی معاشرہ کی تشکیل اور تربیت کے تمام رہنما اصول تفصیل سے بیان کر دئے گئے ہیں کہ دین کا مقصد و مدعا بھی انسان کو اس کے امکانات کی بلندیوں پر پہنچانا ہے۔ اور یہی اقبال کی ہیومنزم کا خلاصہ ہے۔

ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

گلے زخیابان جنتِ کشمیر

کشمیر کے لیے یہ بات باعثِ صد افتخار ہے کہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال اور حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ اقبال اردو کے سب سے مقبول و معروف شاعر اور ملتِ اسلامیہ کے نامور مدبر و مفکر ہیں اور انور شاہ لولابی ایک عبقری صلاحیتوں کے مالک عالم دین، جن کے بارے میں خود اقبال نے یہ بات کہی ہے کہ "اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ انور شاہ کاشمیری کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔"

اقبال کے پورے اردو یا فارسی کلام میں کسی خطۂ زمین، علاقہ یا ملک کا ذکر اس قدر کثرت کے ساتھ نہیں ملتا ہے، جس طرح انہوں نے کشمیر کا تذکرہ بہت ہی عقیدت مندانہ اور ناصحانہ انداز میں کیا ہے۔ کشمیر کا افلاس، محکومیت، تعلیمی اور معاشی پس ماندگی کا احساس ان کے دل و دماغ کو بے چین کر دیتا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں اقبال ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں دو ہفتے کے لیے کشمیر میں قیام پذیر رہے، لیکن اس مختصر قیام کے دوران انہوں نے بہ نظرِ غائر یہاں کی سیاسی، سماجی فکری اور معاشی صورت حال سے مکمل جان کاری حاصل کی۔ ارمغانِ حجاز میں اس مشاہدے کی شاعرانہ مگر سوز و گداز سے بھرپور مصوّری کے نمونے ملتے ہیں

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوز ناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستاں بے دردیٔ ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر
آہ! یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر

یہ بات اقبال نے تب کہی تھی اور یہ اب بھی صحیح ثابت ہو رہی ہے کہ ایرانِ صغیر کے باشندے موجودہ دور میں بھی محکوم، مجبور، مظلوم اور استبداد کی چکی میں پسے جا رہے ہیں۔ شہروں اور دیہاتوں سے آج بھی آہِ سوز ناک سینۂ افلاک کو چیر رہی ہے اور ایک قومِ چرب دست اور تر دماغ کیا کیا مظالم سہہ رہی ہے۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ خطۂ کشمیر کے باشندوں کو صنعت و حرفت کے میدان میں نمایاں کارکردگی پر ہر دور میں امتیاز حاصل رہا ہے۔ یہاں کے شال دوشالے، قالین، کشیدہ کاری اور اخروٹ کی لکڑی پر نقش و نگار کا کام دنیا بھر میں نام پیدا کر چکا ہے، مگر باوجودِ اس حسن و جمال کے اقبال کشمیر کے حالات اور سیاسی و معاشی مسائل سے بہت فکر مند تھے۔

؎ حاجت نہیں اے خطۂ گل شرح و بیاں کا
تصویر ہمارے دلِ پُرخوں کی ہے لالہ
تقدیر ہے اک نام مکافاتِ عمل کا
دیتے ہیں یہ پیغام خدایانِ ہمالہ
سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ

کشمیر کا فطری حسن اپنی رنگا رنگی میں بے مثال ہے۔ اردو، فارسی، عربی، کشمیری اور انگریزی زبان کی شاعری میں سینکڑوں ایسی نظمیں، رباعیات اور قطعات ہیں، جن کا تعلق کشمیر کے قدرتی حسن، اس کے برف زاروں، ندیوں اور گل پوش وادیوں سے ہے۔ کچھ لوگوں نے کشمیر کے حسن کے بارے میں فقط سنا ہے، تو انہوں نے بھی اس کے حسن و جمال کے گیت گائے ہیں اور کشمیر سے دور رہتے ہوئے یہاں کے مناظر فطرت اور مظاہر قدرت کی عکاسی کی ہے۔ اقبال نے بھی "پیام مشرق" میں دو نظمیں "ساقی نامہ" اور "کشمیر" کے عنوان سے تحریر کر کے داخلی جذبات اور احساسات کا اظہار کیا ہے۔ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

خوشا روزگارے، خوشا نوبہارے
نجوم پرن رُست از مرغزارے
زمیں از بہاراں چو بالِ تدروے
ز فوارہ الماس بار آبشارے
تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را
نہاد است در دامنِ کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگاں را
رہا سازد از محنت روزگارے

کشمیر کے کوہ و صحرا، لالہ و گل، بادِ بہار اور دیگر مناظر کی اس سے بہتر تصویر کشی نہیں ہو سکتی ہے جو اقبال نے نظم "کشمیر" میں کی ہے۔

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر
بادِ بہار موج موج، مرغ بہار فوج فوج

صلصل و سار زوج زوج بر سرِ نارون نگر

لالہ ز خاک بر دمید موج با آبجو تپید

خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر

زخمہ بہ تارِ ساز زن، بادہ بہ ساتگیں بریز

قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر

کشمیر کی سیاسی، علمی اور دینی شخصیات پر اقبال کے ہمہ جہت فکر کا گہرا اثر رہا ہے چنانچہ کشمیر کے اکثر سیاسی رہنما اپنی تقاریر اقبال کے انقلاب آفرین اشعار سے عوام کے سوئے ہوئے جذبوں کو انگیخت کرتے ہوئے اور ان میں اپنے مستقبل کو سنوارنے کا داعیہ پیدا کرتے تھے۔ مہجور کشمیر کا انقلابی شاعر تھا اور اس نے کئی نظمیں اقبال کے رنگ اور تتبع میں کہی ہیں۔ اقبال نے خطاب بہ جوانانِ اسلام میں جب یہ فرمایا ؎

کبھی اے نوجوان مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تو مہجور نے اسی آہنگ کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے ایک نظم لکھی جس کے چند اشعار نمونتہً پیش کئے جاتے ہیں۔ ؎

کبھی اے مسلم کشمیر کبھی سوچا بھی ہے تو نے
تو ہے کس گلشن رنگین کا برگِ شاخ عریانی
شکستہ حالیٔ بغداد پر تھا نوحہ خواں حالی
ہے اندلس کے لیے اقبال محوِ مرثیہ خوانی

اقبال کے آفاقی نظریات کا اثر کشمیر کے شعرا اور ادبا کے ایک بڑے حصے پر نمایاں ہے۔ ان شعرا و ادبا میں میر غلام رسول نازکی، شہہ زور کاشمیری، شوریدہ کاشمیری، مرزا غلام حسن بیگ عارف، فاضل کاشمیری،

مرزا کمال الدین شیدا، سلطان الحق شہیدی، غلام نبی خیال، رسول پانپر، حامدی کاشمیری، حکیم منظور امین کامل، مشتاق کاشمیری، رشید نازکی اور غلام قادر اندرابی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اور بھی کئی حضرات فکر اقبال سے گہرے طور وابستہ ہیں لیکن طوالت سے بچنے کے لیے ان سب کا ذکر کرنا یہاں ممکن نہیں۔

کشمیر کے پختہ فکر شاعر جناب میر غلام رسول نازکی کے اس اثر کا یہاں اجمالی تذکرہ کرنا مناسب محسوس ہوتا ہے، کیونکہ نازکی مرحوم کلام اقبال کے رمز شناس تھے۔ اقبال فرماتے ہیں: ؎

میں کبھی جو سر بسجدہ ہوا تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

نازکی صاحب یوں رقمطراز ہیں: ؎

میہ ونن نکتاہ حکیمن نے نوازن
طبیبن، مرشدن دانائے رازن
دلس چھُو قبلہ ساساہ کعبہ ساساہ
میہ ون تم کیاہ کرکھ پانژن نمازن

اقبال ــــــ

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

نازکی ــــــ

چھ کعبس رنگ اسود داغ سینس
عرق چھس زمزمک پیشان جبینس
سیٹھاہ ارمان چھس بخشس نہ ذاتن
شرف یس تمی عطا کرمت مدینس

اقبال ــــ

موت تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

نازکی ــــ

مرن چھنہ موت؟ اَدٕ نو زندگانی
سیٹھاہ رژٕ زندگانی جاودانی
ڈس دمواس پلمی ہے ہے مرن چھسم
ڈس پزٕ جل مرن، بُوتھ چھس جوانی

اقبال کشمیر کے تشخص، ترقی، خوشحالی اور فلاح و صلاح کے زبردست متمنی تھے۔ کشمیر کے مسائل معاملات شخصی حکومت کے مظالم اور اس خطے کی معاشی اور تعلیمی پسماندگی کا خیال اقبال کو ہمیشہ دامن گیر رہتا تھا۔ وہ وادی کے شعراء، تجار، عمائدین اور احباب سے خطے کے بارے میں برابر دریافت کرتے رہتے تھے۔ منشی محمد الدین فوق نے "تاریخ اقوام کشمیر" لکھی تو علامہ نے ایک خط میں انہیں تحسین و آفرین کہا اور اس کام کو مسلمانان کشمیر کے لٹریچر پر احسان سے تعبیر کیا۔ کشمیر سے جو اصحاب تجارت، سیاحت یا دیگر معاملات کے سلسلے میں لاہور جاتے تھے اور پھر اقبال سے شرف ملاقات حاصل کرتے تھے، ان کا بیان ہے کہ اقبال کو اپنے اسلاف کے وطنِ مالوف سے کتنی محبت اور وابستگی تھی۔ مرحوم غلام محمد بٹ زہدہ باغ پلوامہ اور مرحوم محمد یوسف زرگر المعروف مرید کشمیری اقبال کے فدوی، شیدائی اور ان کے اذکار سے بے پناہ متاثر تھے۔ مرحوم محمد یوسف زرگر کا گھر ان کی زندگی میں قصبۂ بیج بہاڑہ میں کلام اقبال کے رنگوں سے مزین اور نغموں سے معمور رہتا تھا، زرگر صاحب کے شب و روز میں شعر اقبال کا اثر چھایا رہتا تھا۔ چنانچہ ان کے فرزند جو پیشے کے اعتبار سے دکانوں کے شٹر بناتے ہیں اور کاروباری قسم کے لوگ ہیں،

کلام اقبال کے ساتھ اپنے مرحوم والد کے سبب اس قدر لگاؤ رکھتے ہیں کہ آدمی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مختصراً یہ کہنا درست ہوگا کہ اقبال اپنے وجود کو ہمیشہ کشمیر کے ساتھ وابستہ سمجھتے تھے اور انہیں اس سرزمین کی خوشحالی، سیاسی آزادی، علمی بیداری اور ترقی میں گہری دلچسپی تھی۔ کشمیر پر حضرت علامہ کے کافی احسانات ہیں، اور یہ فرزندانِ کشمیر پر فرض بنتا ہے کہ ان کے نام اور پیغام سے اپنی نسل کو آشنا رکھیں، اور بڑے پیمانے پر ان کے افکار کی اشاعت و ترسیل کریں

تنم گلے ز خیابانِ جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز ست

★

ڈاکٹر تسکینہ فاضل

"بانگِ درا" میں مشاہیر پر اقبالؔ کی نظمیں

کوئی بھی بڑا شاعر جب کسی دوسرے بڑے شاعر پر نظم لکھتا ہے تو بات ظاہر ہے کہ وہ اس کی شاعری سے یا اس کے کردار کے کسی نہ کسی غیر معمولی پہلو سے متاثر ہو کر اُسے خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے اور اُس کے فن کی قدر سنجی کا تعین بھی کر لیتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک شاعر دوسرے شاعر پر نظم کیوں لکھتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جب کسی بڑے شاعر کے تنقیدی اور شعری معیار کی کسوٹی پر کسی دوسرے شاعر کا کلام پورا اُترتے تو اس شاعر کے کلام سے وہ یقینی طور پر متاثر ہو کر اس پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہے۔ ایک نابغہ روزگار شخصیت کا کسی دوسرے شاعر پر نظم لکھنا بڑی معنویت رکھتا ہے۔ کسی بھی بڑے فن کار کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور اُس کی فن کارانہ عظمت کا اعتراف کرنے اور اُس کے فن کی قدر سنجی کا تعین کرنے کی مختلف صورتیں ہیں مثال کے طور پر اُس پر کوئی نظم لکھ کر یا اس کے کسی شعر یا اشعار پر تضمین کرنے کی شکل میں، یا اُس کا تتبع کرنے کی صورت میں وغیرہ وغیرہ۔ اردو

شاعری میں مشاہیر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے متعدد نمونے ملتے ہیں۔ اور ان تمام نمونوں کو یکجا کر کے ایک وافر اور گرانقدر سرمایہ جمع ہو سکتا ہے۔ بڑے بڑے شعرأ اپنے پیشروؤں یا اپنے عہد کی ممتاز شخصیات کے کارناموں کے پیش نظر انہیں خراج عقیدت پیش کرتے رہے ہیں۔ ان ممتاز ہستیوں سے شعرأ حضرات کی کوئی نسبت رہی یا نہ رہی ہو، لیکن شاعرانہ نسبت کے رہنے کا ضرور علم ہوتا ہے۔ خود حکیم الامت علامہ اقبال کو تقریباً ہر چھوٹے بڑے شاعر نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اُن کے فن کی قدر سنجی کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نوع کی نظموں کا انتخاب ذوالفقار احمد تابش نے "نذر اقبال" کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔ اس انتخاب میں مختلف شعرأ نے علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے کارناموں کی قدر سنجی کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک اقبال کی شاعری کا تعلق ہے۔ انہوں نے اپنے اردو اور فارسی کلام دونوں میں شاعری، فلسفہ، تاریخ اور کئی دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والی معروف شخصیات پر نظمیں لکھ کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اقبال کی اس قبیل کی نظموں سے ان مشاہیر کے صحیح مقام و مرتبے کا تعین کرنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ اقبال کی اس نوع کی نظموں کو اردو اور فارسی شعر و ادب میں اُن کے گرانقدر اضافے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظمیں اقبال کی ادب نوازی، بالغ نظری، باریک مشاہدے، وسیع اور گہرے مطالعے اور مشاہیر کی قدر سنجی کے احساس اور کئی دوسری خوبیوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ اقبال نے ان نظموں میں مختلف شعرأ ادبا اور مفکرین کے متعلق اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار منظوم پیرائے میں کیا ہے۔ یہ نظمیں تفنن طبع، من کی موج یا منہ کا مزا بدلنے کی خاطر نہیں لکھی گئی ہیں۔ اور نہ ہی ان نظموں کی تخلیق سے اقبال کا مقصد شعرأ ادبا اور مفکرین کی جھوٹی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا ہے۔ اقبال کے نزدیک شعر شاعر کے ذہن سے

نہیں بلکہ اس کی روح سے برآمد ہوتا ہے۔ اقبال کے نزدیک شاعر کا مقصد انسان کی اخلاقی اور روحانی تعمیر و ترقی ہونا چاہیے۔ اسی طرح زبان کو وہ اظہار مطالب کا ایک انسانی وسیلہ قرار دیتے ہیں نہ کہ ایک بُت جس کی پرستش کی جائے۔ ان کے نزدیک زندہ زبان انسانی خیالات کے ساتھ ساتھ تغیر پذیر ہوتی ہے جس فن کار کے نظریات میں اس قدر فعالیت، تحرک، بلند خیالی اور مقصد آفرینی کارفرما ہو، ظاہر ہے کہ وہ اپنے عہد کی کسی بھی ادبی شخصیت کو جب موضوعِ شعر بنائے تو اُس کی EVALUATION میں اُس کے نظریات شعر کا کارفرما ہونا کس قدر ناگزیر ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ مشاہیر پر لکھی ہوئی اقبال کی نظموں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مشاہیر پر لکھی گئی اقبال کی نظمیں صرف اُن کے اردو کلام تک محدود نہیں بلکہ اپنے فارسی کلام میں بھی انہوں نے بعض مشاہیر کو خراج عقیدت پیش کیا ہے یہ مقالہ خاصی طوالت کا باعث ہوگا اگر اس میں تمام مشاہیر پر لکھی ہوئی اقبال کی نظموں کا احاطہ کیا جائے۔ بہتر یہی ہوگا کہ اُن کے کسی ایک مجموعۂ کلام سے ایسی نظموں کا انتخاب کیا جائے۔ چنانچہ زیرِ نظر مقالے میں اس مقصد کی خاطر صرف "بانگِ درا" پر اکتفا کیا گیا ہے۔ "بانگِ درا" کی اس قبیل کی نظموں کے عنوانات اس طرح ہیں۔ مرزا غالب، داغ، عبدالقادر کے نام، حالی و شبلی، آرنلڈ، عرفی، شیکسپیئر، ہمایوں وغیرہ وغیرہ

بانگِ درا (۱۹۲۴ء) اقبال کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں شامل مرزا غالب کے زیرِ عنوان نظم میں اقبال جیسا عظیم شاعر اور مفکر غالب جیسے عظیم شاعر اور مفکر کو خراج عقیدت پیش کر رہا ہے۔ اقبال کے یہاں پورے بنی نوع انسان کے لیے ایک پیغام ہے اور اس پیغام کو عالمگیر حیثیت حاصل ہے، اور غالب زندگی کی تلخ سچائیوں کے شاعر ہیں۔ تاہم اقبال اور غالب دونوں کے یہاں چند چیزیں مشترک ملتی ہیں، اور ویسے بھی اگر ہم دنیا کی بڑی زبانوں کے ادب کا مطالعہ کریں تو کئی چیزیں مماثل اور مشترک نظر آئیں گی۔ کہتے ہیں

کہ GREAT MINDS THINK ALIKE غالب کے عظیم شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں، تاہم انہیں اقبال کی طرح اپنی حیات میں وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ چنانچہ اس نابغہ کی قدر سنجی کا تعین کرنے میں بڑی تاخیر سے کام لیا گیا۔ بقول انہیں کے ؎

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

اس تاخیر، بے التفاتی اور ناقدردانی کا احساس انہیں زندگی بھر رہا۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنے کلام میں کئی مقامات پر کیا ہے۔ اُن جیسا نابغہ GENIUS کسی ستائش یا صلے کی تمنا اور پرواہ سے بے نیاز ہو کر ہر صدی پر اپنی گہری چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔ غالب کا تخلیقی ذہن اور ان کی مستقبل شناسی حال کے آئینے میں مستقبل کو دیکھنے کا غیر معمولی شعور اور ادراک رکھتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ناقدین غالب شناسی اور تفہیم غالب کا بھرپور حق ادا کرنے پر مجبور ہو گئے، حکیم ملت علامہ محمد اقبال جیسے عظیم مفکر شاعر نے غالب کے بلند مقام و مرتبے کا تعین کرتے ہوئے انہیں ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ؎

فکر انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزم سخن پیکر ہوا
زیب محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تری آنکھ کو اُس حسن کی منظور ہے
بن کے سوز زندگی ہر شئے میں جو مستور ہے

نظم "مرزا غالب" میں اقبال نے غالب کی غیر معمولی شعری استعداد، تخیل کی بلند پروازی اور اعجازِ سخن کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں جرمنی کے معروف شاعر گوئٹے کا ہم نوا قرار دیا ہے۔

نطق کو سو ناز ہیں ترے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہد مضمون تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر
آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

اقبال غالب کی فن کارانہ عظمت کے معترف ہیں' غالب جیسے عظیم شاعر اور مفکر کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں لیکن اُن کے فن کی عظمت اور اس کی قدر سنجی کا تعین کرنے میں علامہ اقبال نے جس وقتِ نظر سے کام لیا ہے وہ واقعتاً انہیں کا حصّہ ہے اور غالب جیسا فخرِ روزگار اس کا حقیقی معنوں میں حقدار ہے۔

محفل ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ زار
زندگی مضمر ہے تری شوخیٔ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

ڈاکٹر سید عبداللہ "مرزا غالب" کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

" اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی اہمیت اقبال کی نظر میں اس لیے بھی ہے کہ غالب ایک تہذیب کا نمائندہ اور ایک عظیم فکری و ادبی روایت کا وارث و ترجمان بلکہ آخری وارث و ترجمان تھا' جس کے بعد

جہاں آباد یعنی دلی کے بام و در سراپا نالۂ خاموش بن گئے۔ گویا غالب کی قدر و قیمت اس لیے بھی ہے کہ وہ ان تہذیبی و فکری قدروں کا شناسا و معیار شناس تھا۔ جن کی معیار شناسی خود اقبال کے فکر و فن کا امتیاز خاص ہے۔

گویا اقبال کی نظر میں وہ ایک شخص تھا جو ان سے پہلے انہیں راستوں اور شاہراہوں کا سراغ لگا چکا تھا۔ جن کی نشاندہی بعد میں انہوں نے کی"[1]

بانگ درا میں جو نظم "داغ" کے زیر عنوان درج ہے اس میں داغ کو جو اقبال کے قلمی استاد کی حیثیت رکھتے ہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اقبال کی ابتدائی دور کی شاعری پر داغ کے اثرات صاف طور پر دیکھے جا سکتے ہیں' داغ کے رنگ میں لکھی گئی اقبال کی کئی غزلیات "بانگِ درا" اور باقیات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن اقبال ہمیشہ اس اثر کے اسیر ہو کر نہیں رہے بلکہ بہت جلد اس سے آزاد ہو کر شاعری کی دنیا میں اپنی ایک مخصوص اور منفرد آواز سے پہچانے جانے لگے۔ کسی ناقد نے بجا طور پر کیا ہے کہ اقبال کی اس دور کی شاعری جس میں وہ داغ کی تقلید کرتے رہے' صبح کاذب سے تعبیر کرتے ہوئے اسے آنے والی روشنی کا پیش خیمہ بتایا ہے' اقبال پھر بھی داغ جو اپنے وقت کے اساتذہ شعرا میں شمار ہوتے تھے' کی شاگردی پر ہمیشہ نازاں رہے ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغِ سخنداں کا

جناب داغ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کر ڈالا سخن داں بھی سخن ور بھی

حالانکہ اقبال داغ سے خط و کتابت کے ذریعے بہت ہی کم عرصہ تک اصلاح لیتے رہے

---

[1] - ڈاکٹر سید عبداللہ ــ مقامات اقبالؒ ــ ص ۱۶۷

اور بہت جلد داغ نے اقبال کی شاعری کو دیکھ کر کہا کہ اب آپ کا کلام اصلاح کا محتاج نہیں تاہم اقبال اپنی سخن دانی اور سخن وری کا CREDIT داغ ہی کو دیتے ہیں۔
بہرحال نظم "داغ" مرزا داغ کے سانحۂ ارتحال پر لکھا گیا ایک پُر درد مرثیہ ہے۔ اقبال کو اُس وقت بڑی تشویش تھی جب امیر مینائی کے بعد جہاں آباد کے آخری شاعر داغ بھی رخصت ہو گئے۔ نظم میں جہاں آباد کے اس آخری سخن ور کے بانکپن، طرز بیان کی شوخی، مضمون کی باریکیوں اور نزاکتوں، فکر کی بلند پروازی اور تخیل کی سراہنا کی گئی ہے۔ اقبال کو معلوم تھا کہ داغ کے انتقال کے بعد اور بھی نہ جانے کتنے ہی شاعر پیدا ہونگے، جو صاحب اعجاز ہونگے اور کتاب دل کی تفسیریں لکھیں گے۔ اور جن سے خوابِ جوانی کی تعبیریں بھی ہونگیں لیکن داغ جیسے ناوک فگن کا دوبارہ پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اُن جیسی باکمال ہستی کے رخصت ہو جانے سے اردو شاعری میں پیدا ہوئی وسیع خلیج پر اقبال اشکبار ہیں ؎

اشک کے دانے زمین شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی روائے خاک دلی داغ کو روتا ہوں میں
اے جہاں آباد! اے سرمایۂ بزم سخن
ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن
وہ گل رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا
آہ خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا
تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں
وہ مہ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں
اُٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا
یادگارِ بزم دہلی ایک حالی رہ گیا

زیر بحث نظم کے متعلق محمد عبداللہ قریشی کی رائے ملاحظہ ہو۔

"داغ کے کمال فن کا تجزیہ اس سے بہتر شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ یہ اقبال کے تنقیدی رویے کی ایک نادر مثال ہے"[1]

خلیفہ عبدالحکیم کا یہ بیان بھی دیکھئے

"داغ کی وفات پر اس کے سینکڑوں شاگردوں نے مرثیے لکھے جن کا اب کہیں نام و نشان نہیں لیکن اقبال نے جو مرثیہ لکھا وہ داغ کے کمالات کی صحیح تصویر ہے اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال داغ کے کلام سے کس قدر متاثر تھا"[2]

"عبدالقادر کے نام" بانگ درا کی وہ نظم ہے جو علامہ اقبال نے اپنے دوست اور مخزن کے مدیر سر عبدالقادر کے نام ۱۹۰۸ء میں لکھی ہے۔ یہ نظم پہلے سر عبدالقادر کے رسالے "مخزن" میں شایع ہوئی تھی بعد میں اسے بانگِ درا ۱۹۲۴ء میں شامل کیا گیا۔ اس نظم کو اصل میں اُس عہد نامے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جو اقبال نے اپنے دوست سر عبدالقادر کے ساتھ اُس زمانے میں کیا تھا جب مشرق اپنی عظیم الشان روایات اور مذہبی اقدار سے بیگانہ ہو کر رو بہ زوال ہو رہا تھا۔ اور ایسے میں اقبال سر عبدالقادر کو اپنے نیک عزائم سے آگاہ کرتے ہوئے اسلام کی خدمت کرنے پر راغب کر رہے ہیں۔ یہ امر قابل ستائش ہے کہ اقبال نے ۱۹۰۸ء میں سر عبدالقادر سے جو عہد کیا تھا وہ زندگی بھر اُسے نبھانے اور عملی جامہ پہنانے کی خاطر سعی پیہم میں مصروف رہے۔ اقبال کی دور رس نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ مشرق تاریکیوں میں لپٹا جا رہا ہے چنانچہ اس وقت کی تاریکی کے پیش نظر انہیں مستقبل کی تیرگی کے خدشات یقینی نظر آنے لگے تھے۔ اس تاریکی کو دور

---

[1] محمد عبداللہ قریشی۔ معاصرین اقبال کی نظر میں۔

[2] ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ فکر اقبال۔ ص ۱۹۔

کرنے کی خاطر انہوں نے اُمّت مسلمہ کی خدمات کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اقبال کو اپنی قوم سے بے پناہ عشق تھا۔ وہ اس قوم کی فلاح و بقا کے لیے اُمتِ مسلمہ کے دلوں میں عشقِ رسولؐ کی نہ سرد ہونے والی آگ بھڑکانا چاہتے تھے۔ اقبال سر عبدالقادر کو اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ مسلمان قوم کو غیر اسلامی روایات کے چنگل سے نجات دلا کر انہیں عربی زبان، تہذیب اور روایات کا شیدائی بنائیں۔ اس نظم کے ساتویں شعر میں یہ تلمیح برتی گئی ہے ؎

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا یہ بیان ملاحظہ کیجیے:۔

"۱۹۰۸ء میں دمشق سے مدینہ منورہ تک ریل آگئی تھی۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر وقت انقلاب رونما رہتا ہے، چنانچہ دیکھ لو، مدینہ میں اونٹ بیکار ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان بھی اپنے اندر انقلاب پیدا کریں یا کم از کم اس کے لیے تیار رہیں"[1]

اقبال ۱۹۰۵ء میں انگلستان چلے گئے اور کئی برس وہاں رہے۔ مغربی ممالک میں رہ کر بھی جہاں علم اور سائنس کی بے پناہ ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کے بہکنے اور بھٹکنے کے سامان قدم قدم پر دستیاب ہیں، اقبال کا کردار آلودگیوں سے پاک رہا۔ انہوں نے لندن میں بھی آداب سحر گاہی کے نہ چھوٹنے کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے۔ زیر بحث نظم میں بھی اس طرف اشارہ موجود ہے کہ یورپ میں قیام کے دوران اگر ہم غیر اسلامی زندگی سے محفوظ رہے تو وہ صرف عشق رسولؐ کی بدولت رہے۔ اس لیے دنیا کو اس لازوال نعمت سے روشناس کرانا ہمارا فرض ہے۔ نظم کے اختتام پر اقبال نے سر عبدالقادر کو اس دنیا میں شمع کی مانند جینے پر آمادہ کیا ہے جو خود تو جل کر ختم ہو جاتی ہے لیکن اپنے گرد و پیش

---

[1] ۔ شرح بانگِ درا۔ (پروفیسر یوسف سلیم چشتی) ص ۳۳۹

کو منور کر دیتی ہے۔ اسی طرح ہم بھی شمع کی مثال کو اپنا کر بزم گہ عالم میں خود جلنے اور دیدہ اغیار کو بینا کر دینے کا عہد کریں۔

"بانگِ درا" میں اسیری کے زیرِ عنوان جو مختصر سی نظم ملتی ہے وہ علی برادران یعنی مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی قید سے رہائی کے موقعے پر اقبال نے ایک جلسے میں پڑھ کر سنائی تھی، یہ جلسہ خلافت کمیٹی کے زیرِ اہتمام منعقد کیا گیا تھا۔ مذکورہ نظم میں علی برادران کو ان کی بلندیٔ فطرت کی بناء پر خراج پیش کیا گیا ہے۔ انہیں اسیری کے عمل نے اور بھی محترم بنا دیا ہے، کیونکہ اُن کی اسیری ان کے اپنے کسی ذاتی مفاد کے نتیجے میں عمل میں نہیں لائی گئی تھی بلکہ مسلمانوں کی فلاح اور بہبود کے جذبے اور بے غرض عمل کی پاداش میں فرنگیوں نے انہیں قید کر لیا تھا۔ علی برادران کی اسیری کو اقبال نے قطرۂ نیساں سے مشابہ کیا ہے جو صدف کی قید میں رہنے کے بعد ہی موتی بن کر بیش بہا ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جسے مُشکِ اذفر کہا جاتا ہے وہ خون کی ایک بوند ہے اور یہی خون کی بوند جب آہو کے ناف میں قید ہو جاتی ہے تو ایک خاص قسم کا مشک بن جاتی ہے۔ اقبال کے نزدیک فطرت ہر شئے کی اس طرح تربیت نہیں کر سکتی ایسے طاہر کم ہی ہیں جنہیں قفس میں قید کر کے اُن کی عزت افزائی کی جاتی ہے۔ کوے اور چیل بھی تو پرندے ہیں لیکن کوئی انہیں قید نہیں کرتا۔ یہ سعادت تو صرف شاہین اور شاہباز کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر علی برادران کی فطرت میں اقبال باز اور شاہین کی خوبیوں کے پیشِ نظر انہیں خراج پیش کرتے ہیں۔

نظم "ہمایوں" اقبال نے اپنے محترم دوست جسٹس شاہ دین ہمایوں کے انتقال پر لکھ کر مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ جسٹس شاہ دین ہمایوں اور اقبال کے آپس میں بڑے اچھے دوستانہ مراسم تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی صحبتوں میں بیٹھ

کر ایک دوسرے سے فیضیاب ہوتے۔ جسٹس مرحوم شاعر بھی تھے۔ اُن کے کلام کا مجموعہ "جذباتِ ہمایوں" ان کے انتقال کے بعد اُن کے صاحبزادے میاں بشیر احمد نے شایع کیا۔ شاعر اور ادیب ہونے کے ناطے اقبال کو مرحوم سے بڑی عقیدت تھی۔ اقبال مرحوم کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ "بانگِ درا" کی نظم "ہمایوں" کے علاوہ بھی مرحوم کا ذکر اقبال نے اپنے اشعار میں جستہ جستہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر اس غزل کے اشعار میں ؎

لاؤں وہ تنکے کہاں سے آشیانے کے لیے
بجلیاں بے تاب ہوں جس کے جلانے کیلئے
ترک کر دی غزل خوانی مرگ اقبال نے
یہ غزل لکھی ہمایوں کو سنانے کے لیے

اقبال نے مذکورہ بالا غزل پر نظر ثانی کرتے وقت مقطع کو قلمزد کر دیا تھا۔ نظم "ہمایوں" میں جسٹس شاہ دین ہمایوں کو مخاطب کر کے ان کی اُن خدمات کو سراہا گیا ہے جو وہ اپنی قوم کے لیے زندگی بھر انجام دیتے رہے۔ مرحوم کی ذات کو ملّتِ اسلامیہ کے لیے باعث فخر قرار دیا گیا ہے۔ مرحوم اگرچہ جسمانی اعتبار سے کمزور تھے لیکن اُن کی طبع ستارے کی مانند تھی۔ مرحوم کے پیکرِ ناتواں میں جو دل تھا، وہ کسی سے خائف نہیں تھا۔ انہیں موت کی کوئی پرواہ نہ تھی، جس طرح رات کے بعد دن کا آنا ناگزیر ہے اسی طرح موت کے بعد دوبارہ زندگی کا تصور یقینی ہے، غافل موت کو زندگی کا اختتام سمجھتے ہیں لیکن موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ جسے اختتام زندگی سمجھا جاتا ہے، وہیں سے دراصل دائمی زندگی کی صبح کا طلوع ہوتا ہے۔

"نالۂ فراق" علامہ محمد اقبال نے اپنے مشفق اور مربی استاد پروفیسر ٹامس آرنلڈ کی یاد میں ۱۹۰۴ء میں لکھی تھی۔ استاد کے انگلستان واپس جانے پر شاگرد نے اپنے قلبی تاثرات اور جذبات کا جس انداز میں اظہار کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آرنلڈ کی صحبت اقبال

ے لیے کس قدر اہمیت کی حامل تھی، شاگرد کو جب استاد کی صحبت میسر تھی تو دنیا
ہر چیز بارونق دکھائی دیتی تھی۔ اب جو یہ صحبت میسر نہیں تو اقبال کی دنیا تیرہ
ار ہو کر رہ گئی ہے۔ نظم میں غم کے جذبات اور احساسات کے اظہار سے۔

آزلڈ کے ساتھ اقبال کے غیر معمولی لگاؤ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ استاد کے
اق میں جذبات کی وارفتگی کا یہ عالم ہے کہ ان کے رخصت ہو جانے کے بعد
بال گوشۂ عزلت اختیار کر کے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ ایسے میں
ہ جنگل کا رخ کر لیتے ہیں، اقبال کے ذہن و قلب پر سہ رہیئے اب ایسی جگہ
ل کر جہاں کوئی نہ ہو والی کیفیت طاری ہے اس کے بعد استاد کی قیام گاہ کی طرف
لے جاتے ہیں جہاں کے در و بام میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا ہے لیکن جب وہاں
ین کو نہیں پاتے، جس سے مکان کو شرف حاصل تھا۔ اقبال اپنے آپ کو ایک اجنبی
طرح پاتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب وہ اپنے استاد سے فیض یاب ہونے کے
ل ہو چکے تو دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اگر وہ کچھ روز اور قیام کر لیتے تو
قد جانے وہ کیا سے کیا ہو جاتے۔ اقبال استاد کی صحبت کو اپنے لیے ابر رحمت قرار
یتے ہیں جو اُن کے گلستاں کی کلیوں کو کسی حد تک سیراب کر کے رخصت ہو گیا۔ اقبال
پنے استاد کو بحر علم کہہ کر ان سے استفسار کرتے ہیں کہ مجھے پیاسا چھوڑ کر آپ کہاں چلے
گئے۔ آپ کی ذات میرے لیے افزایش علم کا باعث تھی۔ اور آپ ہی کے دم سے
یرے دل میں حصول علم کا جذبہ موجزن تھا۔ آپ کے جانے سے میرا ذوق علمی
رد پڑ گیا ہے ؎

ذرہ میرے دل کا خورشید ہونے کو تھا
آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا

نخل مری آرزوں کا ہرا ہونے کو تھا

آہ کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا

ابر رحمت دامن از گلذار من برچید و رفت اند کے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

اقبال نے اپنے اُستاد کو کلیم کا ذرہ، سینائے طور کے لقب سے یاد کیا ہے۔ نظم کے آخری بند میں شاگرد اپنے استاد سے ملنے اور ان سے گفتگو کرنے کی خاطر بیچ کے فاصلے کو طے کرنے اور انگلستان جانے کا ارادہ کرتا ہے حالانکہ استاد کی تصویر شاگرد کے پاس موجود ہے مگر تصویر دیکھنے کے بعد بھی شاگرد کا جی نہیں بھرتا۔ وہ تو اس سے ہم کلام ہونے کا شدید خواہاں ہے ؎

تاب گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا

خامشی کہتے ہیں جس کو سخن تصویر کا

نظم کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک عاشق اپنے معشوق کی دید کا بے صبری کے ساتھ منتظر ہے، معشوق سامنے ہو تو دنیا کی ہر چیز بارونق نظر آتی ہے، اور فرقت کا عالم ہو تو عاشق کو دشت کی ویرانی ہی راس آجاتی ہے پروفیسر آرنلڈ نے بھی اپنے شاگرد اقبال کے متعلق بڑی اچھی رائے دی ہے "ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے"۔

اقبال کا طبعی میلان شروع سے ہی فلسفے کی طرف تھا جس کی تشکیل اور توسیع میں پروفیسر آرنلڈ نے ایک اہم کردار ادا کیا، پروفیسر آرنلڈ ایک متبحر عالم اور فلسفے کے استاد تھے۔ اقبال نے فلسفے کی باقاعدہ تعلیم انہیں سے حاصل کی۔ اُن کی شعری زندگی میں پروفیسر آرنلڈ کو اس وجہ سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اقبال کی زندگی میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب انہوں نے شعر گوئی ترک کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ مگر اقبال کے دوست

سر عبدالقادر کے اصرار پر یہ فیصلہ پروفیسر آرنلڈ پر چھوڑ دیا گیا کہ اگر پروفیسر صاحب اقبال کے اس ارادے پر اپنی رضامندی کا اظہار کریں تو ویسا ہی ہوگا۔ بالآخر سر عبدالقادر کی رائے سے (جو اقبال کے شعر گوئی کے ارادہ سے ہرگز متفق نہ تھے) پروفیسر آرنلڈ متفق ہو کر یہی طے پایا کہ اقبال کا ترک شعر گوئی کا ارادہ جایز نہیں۔ پروفیسر آرنلڈ کے ولایت رخصت ہو جانے کے بعد اقبال کے جذبات میں ایک طوفان بپا ہوا۔ مختلف علمی اداروں کے اہتمام سے اُن کے اعزاز میں کئی جلسے منعقد کیے گئے اور ان میں بہت سی نظمیں پڑھی گئیں۔ اقبال اس وقت "نالۂ فراق" لکھ چکے تھے تاہم انہوں نے نظم میں اپنے وفور جذبات کے دردمندانہ اظہار کے پیش نظر اسے کسی عام جلسے میں پڑھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اقبال کے بقول پروفیسر صاحب کی تشریف آوری کے بعد "دلی تاثرات کی شدت اور بھی بڑھ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نظم میں بہت سی تبدیلی ہو گئی" "نالۂ فراق" شروع میں سر عبدالقادر کے پرچے "مخزن" ۱۹۰۴ء کے مئی کے شمارے میں شایع ہوئی تھی اور پہلے یہ نظم آٹھ بندوں پر مشتمل تھی، مگر اقبال نے جب "بانگِ درا" کو ترتیب دیا تو اس وقت اس میں سے تین بند حذف کیے گئے۔

اقبال نے انگریزی زبان و ادب کے عظیم شاعر اور ڈرامہ نویس پر "بانگِ درا" میں شیکسپیر کے عنوان سے دو بندوں پر مشتمل نظم میں شیکسپیر کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بانگِ درا کی کئی نظمیں انگریزی شعرا سے ماخوذ ہیں، مثلاً رخصت اے بزم جہاں، ایک پہاڑ اور گلہری، ہمدردی، عشق اور موت، پیام صبح وغیرہ وغیرہ۔ اسلوب احمد انصاری کے بقول اقبال کی معروف نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کی تخلیق کے وقت اُن کے تحت الشعور میں ولیم کوپر کی نظم ON THE RECEIPT OF HIS MOTHER'S PICTURE ضرور رہی ہوگی۔ ولیم شیکسپیر کو خراج عقیدت

پیش کرنے اور ان کے فن کی قدر سنجی کا تعین کرنے کے لیے شیکسپیر کے وسیع اور بسیط مطالعے کی ضرورت ہے۔ شیکسپیر کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے انسانی فطرت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے، چنانچہ انہیں بجا طور پر فطرتِ انسانی کا نباض کہا گیا ہے۔ اقبال نے شیکسپیر کے فن میں فطرتِ انسانی کی مرقع کشی کی ہے اور انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں، ان کی گہرائیوں اور گتھیوں کی تشریح اپنے ڈراموں میں کی ہے، چنانچہ ان کے حسن کلام کو دلِ انسان کا آئینہ کہا گیا ہے ؎

تجھ کو جب دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا
تابِ خورشید میں خورشید کو پنہاں دیکھا
چشمِ عالم سے تو ہستی رہی مستور تیری
اور عالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا
حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
راز داں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

اقبال نے اردو کے چند معروف شعرا کے علاوہ فارسی شعر و ادب کے بعض عظیم شعرا پر بھی نظمیں لکھ کر انہیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ عُرفی کے عنوان سے "بانگ درا" میں جو نظم ملتی ہے اُس میں دراصل عرفی ہی کے ایک مشہور شعر پر تضمین کر کے عرفی کو اقبال نے خراج پیش کیا ہے۔ نظم کے پہلے دو اشعار میں عرفی کے کلام میں تخیل کی بلندی اور عاشقانہ سوز و گداز کی سراہنا کی گئی ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں کئی مقامات پر اس بات کی شکایت کی ہے کہ مسلمانوں میں وہ تڑپ اور جد و جہد کا جذبہ سرد پڑ گیا ہے جو ان کے اسلاف کی امتیازی شان تھی۔ چنانچہ زیرِ بحث نظم میں بھی اقبال عرفی کی تربت سے یہی شکایت کرتے ہیں کہ قوم خوابِ غفلت سے بیدار ہونا نہیں چاہتی، اُسے میرا پیغام بیداری پسند نہیں اور نہ متوجہ بھی کیسے ہو سکتی ہے جب کوئی قوم تاریکی کو اپنا مقصدِ حیات بنا لے تو وہ روشنی کی

طرف کیسے مایل ہو سکتی ہے۔ عرفی نے اقبال کی شکایت سن کر جواب دیا کہ اہل جہاں کا شکوہ مت کر بلکہ قوم کو گہری نیند میں سوتے ہوئے دیکھ کر تجھے اپنی لَے کو اور تیز کرنا چاہیئے۔ اگر قوم شریعت کی پابندی کو گراں خیال کرتی ہے تو اسے اپنا پیغام زیادہ جوش و خروش کے ساتھ سنا۔

علامہ اقبال شبلی کی تصنیف "شعر العجم" کو مسلمانوں پر اُن کا احسان قرار دیتے ہیں۔ حالی و شبلی دونوں مسلمانوں کے لیے گہری ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ دونوں نے مسلمانوں کی فلاح و ترقی اور سربلندی کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ اقبال حالی و شبلی دونوں کے جونیئر معاصر تھے۔ تاہم اقبال نے شبلی کی وفات تک جو خدمات انجام دی تھیں، اُن کے پیش نظر شبلی اقبال کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حالانکہ اقبال کو شبلی کی وفات کے بعد عالمگیر شہرت حاصل ہونے لگی۔ یہ اقبال کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں شبلی اور حالی جیسے بزرگ اور اُمتِ مسلمہ کی درد مند شخصیتوں کی رہنمائی نصیب ہوئی۔ حالی نے قوم کو اپنی غلطیوں کا احساس دلایا۔ مسدس میں مسلمانوں کے انحطاط و زوال پر حالی ماتم کناں ہیں، اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف اُمتِ مسلمہ کے انحطاط و زوال پر ماتم کیا بلکہ اس کا سدِباب کرنا بھی سکھایا۔ حالی اور شبلی دونوں بزرگ ہستیوں پر بانگِ درا کی نظم نہ صرف ان دو ممتاز ہستیوں کا مرثیہ ہے بلکہ اسے پوری مسلمان قوم کے مرثیے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اقبال نظم میں دریافت کرتے ہیں کہ کیا سبب ہے کہ قوم پستی کی طرف جا رہی ہے، مسلمان قوم جس سے تمام علوم و فنون اور سائنس نے ترقی کی اور جس کی بدولت تمام تہذیبیں اور علوم معرض وجود میں آئے، کی پریشانی کا سبب کیا ہے؟۔ اقبال یہاں پر تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں، ورنہ انہیں بخوبی معلوم ہے کہ یہ سب کچھ غفلت کے سبب ہوا ہے۔ قوم کے رہنما کی غفلت قوم کی تباہی کا باعث ہے چنانچہ اقبال اس تباہی سے محفوظ رہنے کے لیے ایسے اشخاص کی تلاش کرنے کے خواہاں ہیں جو اس کا سدباب کر سکیں۔ حالی اور شبلی جیسی دو بزرگ ہستیوں کے وجود سے،

قوم کی بہار تھی اور چونکہ اب یہ دونوں ہستیاں ملکِ عدم کو سدھار چکی ہیں، اس لیے بہار کی جگہ خزاں نے لی ہے۔ ان کے انتقال سے قوم کا جو زیاں ہوا ہے اس کے سبب زندگی کے ہر شعبے میں ضعف پڑا ہے۔ حالی اور شبلی دونوں نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی سعی پیہم کی لیکن اب جب یہ دونوں نہیں رہے اس لیے کسی بھی شخص کو اس کا سدباب کرنے کی فرصت ہی نہیں، ایسی حالت میں ذہن پریشان ہے اور اس سنجیدہ مسئلہ کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ اقبال نے داغ پر نظم لکھتے ہوئے ضمناً حالی کی عظمت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس وقت اگر کئی عظیم ہستیوں کے یکے بعد دیگرے انتقال کر جانے سے اقبال کو بڑا ہی دکھ ہوا، تاہم ابھی حالی کے وجود سے انہیں کئی توقعات وابستہ تھیں، مگر جب حالی بھی انتقال کر گئے تو اقبال کو گہرا صدمہ ہوا اور ادب اور شاعری کی دنیا تاریک نظر آنے لگی۔

سرسید احمد خان پر بھی "بانگِ درا" میں اقبال کی نظم "سید کی لوحِ تربت" درج ہے، جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر
اے کہ تری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر

اقبال گرچہ سرسید کے بڑے معترف تھے، تاہم اُن کے نظریہ تعلیم پر انہوں نے بڑی سخت تنقید کی ہے۔ نظم "مسلمان اور تعلیم جدید" کا یہ شعر ملاحظہ کریں ؎

رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا تجھے
واجب ہے صحرا گرد پر تعمیلِ فرمانِ خضر
لیکن نگاہ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری
"رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد"

ڈاکٹر صورت جاں

اقبالؔ کی فطرت نگاری

فطرت ایک وسیع الاطراف موضوع ہے۔ اس کا مطالعہ اور مشاہدہ انسان کو فکر کی وسعت اور نظر کی رفعت عطا کرتا ہے۔ تخلیقی ادیبوں، قلم کاروں، شاعروں اور منظر نگاروں نے اپنی جداگانہ صلاحیتوں اور فنی نزاکتوں کے ساتھ اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن جہاں تک اقبال کی فطرت پسندی کا تعلق ہے۔ انہیں فطرت کے ذرے ذرے میں شانِ خداوندی نظر آتی تھی۔ فطرت کے مناظر اور مظاہر کے ساتھ اقبال نے اپنا رشتہ ذہنی طور پر اس قدر مستحکم کیا تھا کہ ان کے کلام میں ہزارہا مقامات پر فطرت اپنے جلوے دکھاتی اور اپنے مظاہر سے سکون و طمانیت کی حالت پیدا کرتی ہے۔ فطرت پسندی کے اسباب میں دراصل توحید وہ اہم سبب ہے جس کی رو سے ہر ذرہ، پتا، شجر، حجر اور رات دن اللہ کی وحدانیت کے نغمے الاپتے ہیں اور یہ اس ذات عالی کے آثار ہیں جو لافانی اور لاشریک ہے۔ فطرت نگاری ایک بہت بڑا فن ہے اور اس فن کو اقبال نے اس قدر خوبی کے ساتھ برتا ہے کہ اقبال اردو کے چوٹی کے فطرت نگار شاعروں میں شمار ہو سکتے ہیں۔ اشفاق حسین ناصر نے اپنے ایک مضمون "اقبال اور فطرت نگاری" میں لکھا ہے:

"وہ فکر و تخیل سے فطرت کے دلآویز اور شوخ مرقعوں میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے اور اس کے ذریعے حسن کے نئے نئے اور دل فریب پیکر تخلیق کرتا ہے۔ عارضِ گل کی تابانی، شاخوں کا آنچل، عروس لالہ کا حسن، چشمہ کوہسار، مہتاب کی کرن، برگ گل پر شبنم کے گوہر اور بہتے ہوئے دریا کی روانی ادبی مصوری کے تخیل ہیں جس سے شاعری کا حسن بڑھتا ہے۔ شاعر تخلیقی عمل میں یہ تخیل دل کش بنا کر پیش کرتا ہے۔ ادبی مصوری لطیف تصورات اور جذبہ و تخیل کے احساسات سے پروان چڑھتی ہے اور جب شاعر آرٹ کے ذریعے فطرت سے تعلق پیدا کرتا ہے تو شاعری ادبی مصوری کے روپ میں ڈھل جاتی ہے۔ اقبال ادبی مصور اس لیے ہے کہ اس کا آرٹ فطرت سے گہرا تعلق رکھتا ہے"[1]

جب ہم اقبال کے کلام میں فطرت کی مصوری کی تلاش میں نکلتے ہیں تو بہار اور خزاں میں فطرت کی جو بھی رنگینیاں، دریاؤں، جھیلوں اور ندیوں میں جو بھی روانیاں اور سبزہ زاروں اور پھولوں میں جس قدر بوقلمونیاں موجود ہیں وہ نکھر نکھر کے ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہیں کبھی وہ بہار کے پورے کارواں کا ذکر کرتے ہیں تو دامن کہسار کو باغ ارم سے مشابہ کرتے ہیں۔ رنگا رنگ پھولوں کے نام لیکر ہمارے سامنے رنگ و بو کی ایک مشکبار فضا سامنے لاتے ہیں۔ ندی نالے کا ذکر، موتی ہے تو پانی کا اچھلنا، تڑپنا، سنبھلنا اور پیچ کھا کھا کر نکلنے کا منظر نہایت ہی دلپزیر پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔

قدرت کے خوبصورت کارخانے کی متنوع اشیاء اور مناظر سے اقبال کی نظر لذت حاصل کرتی ہے۔ ان کے خیال میں فطرت کے اندر جلال اور جمال دونوں

---

[1] اقبال اور فطرت نگاری ۔ اشفاق حسین۔ ص ۱۴۱
مضمون مشمولہ اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ ۔ مرتبہ : سعید معراج نیر

کیفیتیں موجود ہیں، چنانچہ علامہ کے نزدیک جس شئے میں جلالی شان نہیں وہ شئے نامکمل اور ناکارہ ہے۔ اقبال فطرت کی زبردست تعریف و توصیف کرتے ہیں مگر وہ فطرت پرستی کی طرف اپنے قاری کو نہیں لے جاتے ہیں جیسا کہ وارڈس ورتھ کی شاعری کا خاصا ہے۔ وہ پڑھنے والے کو فطرت کی پرستش کی طرف بتدریج لے جاتے ہیں۔ اقبال کا ذہن فطرت سے مسرت اور بصیرت اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ حیات اور کائنات کے اسرار و معارف کی تلاش کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اقبال کو دوسرے فطرت نگار شعراء میں جو بات ممتاز اور مخصوص مرتبہ عطا کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اقبال اپنے تخیل کی بلندی سے ایسی تشبیہیں اور صورتیں پیدا کرتے ہیں جن کا جواب نہیں۔ مثال کے طور پر اس بند میں کیا سماں بندھ گیا ہے۔ ؎

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلف رسا
دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر
خوش نما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر [1]

فطرت نگاری کے تعلق سے اقبال کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے فطرت اور آرٹ کو ایک دوسرے کے ساتھ ایسے مربوط کر دیا ہے کہ شاعری ساحری معلوم ہوتی ہے شاعر چاند کی پرسکون خاموشی، درخت کی ٹہنیوں کی خاموشی اور کہساروں کے سبزہ زاروں کی خاموشی کا ایسا نظارہ لفظوں کے لباس میں ڈھانپتا ہے کہ فکر و فن حیرت کی انتہا کو چھو جاتی ہے۔ "ایک شام" میں حسن کی خاموشی "ش" کی تکرار کے ساتھ یوں بیان ہوئی ہے۔

---

[1] بانگ درا۔ اقبال۔ ص ۲۳ ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خاموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش
کوہسار کے سبزہ پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے

ان اشعار میں خاموش، نوا فروش، سبزہ پوش، آغوش اور بے ہوش جیسے الفاظ استعمال میں لاکر فنکاری کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔

اقبال نے اپنی بڑی نظموں مثلاً مسجد قرطبہ، ذوق و شوق اور طلوع اسلام میں جہاں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو دنیا کے سامنے پورے آب و تاب کے ساتھ لایا ہے۔ وہاں ان نظموں میں منظر کشی کے اعلیٰ نمونے بھی پیش کئے ہیں۔

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسن ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں

۱؎ بانگ درا۔ اقبال ص ۱۲۸ ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڈھ

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر

کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں [1]

ان اشعار پر غور کرنے سے ہمارے سامنے یہ بات کھل کر آجاتی ہے کہ اقبال منظر کشی کرتے ہوئے ایک نیا باب کھول دیتے ہیں اور ایک نئی روایت کو آگے بڑھا دیتے ہیں، سحاب شب کی سرخ و کبود بدلیاں اور کوہ اضم کو متے والی رنگ برنگ طیلساں کو مدنظر رکھتے ہوئے دنیا کے بڑے ڈیزاین ساز نقاش اور آرٹسٹ زبردست فن پاروں کو جنم دے سکتے ہیں۔

فطرت کے ساتھ گہرا رشتہ پورے کلام اقبال سے ظاہر ہے لیکن اقبال کی فطرت پسندی فطرت پرستی اور فطرت کے مظاہر میں گم گشتگی کا اصل زمانہ "بانگ درا" کا زمانہ ہے، جس میں مناظر فطرت سے متعلق ان کی تصوری اور منظر کشی ماہرانہ شکل وصورت اختیار کرلیتی ہے۔ بانگ درا کے الفاظ اقبال نے دراصل اپنی مشہور نظم "ترانہ ملی" میں یوں استعمال کئے ہیں

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

۱۹۲۴ میں بانگ درا پہلی بار شایع ہوئی اور یہ کتاب ملک کے طول وعرض میں کتاب خانوں، علمی گھرانوں، اسکولوں اور دانشگاہوں کی زینت بن گئی، اقبال کی شہرت، مقبولیت اور ادبی حلقوں میں ان کی عزت بانگ درا کے سبب قایم ہوگئی اور ملک کے اطراف واکناف میں اس کتاب میں درج نظمیں زبان زد خاص وعام ہوگئیں۔ بانگ درا کی نظموں میں ہمیں اقبال کے ایسے خیالات بھی ملتے ہیں جن کا فلسفے کے ساتھ تعلق ہے یعنی ان میں انہوں نے ایسے معاملات اور مسایل پیش کئے ہیں

---

[1] ۔ علامہ اقبال ۔ بال جبریل ۔ ص ۱۱۱ ۔ اعتقاد پبلشنگ ہاوس ۱۵۴۱ گلی کوتانہ نئی دہلی

جو زندگی کے مقاصد اور مسایل، تصورِ ذات، تصورِ خودی اور عشق و حسن سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ فسفیانہ رنگ بالخصوص گلِ رنگین، خفتگانِ خاک، ماہِ نو اور بزمِ قدرت میں نظر آتا ہے۔ بانگ درا کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ اقبال کی شاعری میں یقین اور پیغام کا رنگ دکھائی دیتا ہے چنانچہ ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ کے طلبہ کے نام جو نظم انہوں نے لکھیں وہ دراصل ان کا پہلا پیغام ہے اور بعد میں اس پیغام کی روشنی عام کرنے پر اقبال متوجہ رہے۔

اوروں کا پیام اور ہے میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

طائرِ زیردام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے

آئی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکون
کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غم کدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے [1]

بانگ درا کے مطالعے کے دوران ہم اقبال کی ترکیب بندی و اصطلاح سازی اور قادر الکلامی کے جا بجا نمونے دیکھتے ہیں مثلاً اقبال نے اس قسم کی ترکیبیں استعمال کی ہیں جن کا رشتہ بنیادی طور پر فارسی سے جڑ جاتا ہے۔ توسنِ ادراک، قتیلِ ذوقِ استفہام، قربِ فراق آمیز، دخترِ خوش خرام،

---

[1] اقبال۔ بانگ درا۔ ص۔ ۱۱۴۔۱۱۵۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ

ابر جوئے سرود آفریں، سیارہ ثابت نما، مایہ دار اشک عنابی وغیرہ، بانگ درا کی سلاست، روانی، مصوری، منظر نگاری اور اعلیٰ فن کاری پر تبصرہ کرتے ہوئے شارح اقبال پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں

"بانگ درا کی اکثر غزلوں اور نظموں میں غضب کی روانی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال شعر اس وقت کہتے تھے جب ان کی طبیعت شعر گوئی پر مایل ہوتی تھی۔ تصویر درد، ترانہ ملی، شکوہ، جواب شکوہ، شمع اور شاعر اور خضر راہ میں سلاست اور روانی کے بہترین نمونے مل سکتے ہیں۔ بانگ درا میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں کہ جن میں اقبال نے مناظر قدرت کی تصویر کھینچی ہے چونکہ ان کی قوت بہت بڑی ہوئی تھی۔ اس لیے انہوں نے اس فن کے بہترین نمونے اپنی شاعری میں پیش کر دیے ہیں۔ ہمالہ، ابر کہسار، انسان اور بزم قدرت، ابر اور ایک شام اُن نظموں میں اقبال نے مصوری اور منظر کشی کا کمال دکھایا ہے" [1]

اقبال کی فطرت نگاری میں رنگ و آہنگ کا ایسا امتزاج ملتا ہے جس کی دوسرے شعرا کے ہاں بڑی کمی ہے۔ اقبال کے آہنگ میں فطرت کا صاف و شفاف سرور ملتا ہے۔ اور اس سرود میں وہ نغمگی اور پاکیزگی موجود ہے جو فطرت کے پورے وجود میں شامل ہے۔ آہنگ اقبال میں فطرت کی اشیاء کے ساتھ ایک گہرا تعلق، یادوں کا ایک طویل سلسلہ اور تمناؤں کا ایک قافلہ رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔ جب اقبال مناظر فطرت کا ذکر کرتے ہیں تو وہ سارے مناظر تصویروں کی طرح ہمارے سامنے آتے ہیں جیسے کہ باغ کی بہاریں، آبشاروں کی صدا، شام کی خاموشی اور درختوں پر تفکر کی کیفیت کا ایسا منظر ہمارے سامنے آتا ہے کہ لگتا ہے یہ ساری چیزیں ہمارے سامنے موجود ہیں اور ہمیں دعوت نظارہ دیتی ہے۔

---

[1] پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۔ بانگ درا ۔ مع شرح ۔ ص ۴۳
اعتقاد پبلشنگ ہاؤس گلی کوتانہ سوئیوالاں دہلی۔

منظر نگاری کے دوران شاعروں نے سورج کا ذکر مختلف پیرایوں میں کیا ہے۔ آفتاب کو روشنی اور گرمی کا منبع قرار دیا گیا ہے اور اس سے حاصل ہونے والی توانائی کو طاقت کا ایک بہت بڑا ذریعہ خیال کیا ہے مگر اقبال آفتاب کو ایک دوسرے ہی انداز میں پیش کرتے ہیں ان کے خیال میں سورج کا وجود آسمان کے لیے باعث زیب و زینت ہے جب وہ طلوع ہوتا ہے تو تاریکی دور ہو جاتی ہے۔ ساری دنیا اس کی روشنی اور گرمی سے فیض یاب ہوتی ہے لیکن اقبال اس روشنی کا خواہاں ہے جس سے دل کی آنکھیں منور ہو جائیں۔ سورج انسانوں کی طرح مادی ضرورتوں اور تقاضوں میں گرفتار نہیں ہے اور وہ اس قدر بلندی پر چمک رہا ہے کہ دنیا کی بلندیاں اور ہستیاں دونوں اس کے لیے برابر ہیں۔ اقبال یہی وسعت اور رنگینی اپنے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اپنی نظم "آفتاب صبح" میں شاعر منظر نگاری کرتے ہوئے آفتاب سے مخاطب ہے کہ اے آفتاب اگر تو دنیا والوں کی مصیبت میں شریک نہیں ہے تو پھر تجھے کوئی فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی۔ تجھ میں اور مجھ میں فرق و اختلاف یہ ہے کہ تو ذوق جستجو سے محروم ہے اور جبکہ میں حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں اور اس کے لیے میں ہر وقت کوشاں ہوں، چاہے مجھے کامیابی ملے یا نہ ملے۔ اس نظم کے متعلق ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے۔

"اس نظم میں اقبال نے بین الاقوامیت کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ سورج کی نظر میں زیر و بالا ایک ہیں۔ وہ ہر جگہ یکساں چمکتا ہے اور ہر ملک میں اپنی روشنی پھیلاتا ہے۔ اس طرح سے اقبال کی خواہش ہے کہ وہ بھی امتیاز ملت و آئین کے پردے چاک کر ڈالیں اور ساری دنیا کی بہبودی کے لیے کوشش کریں۔ دراصل اقبال کے یہاں فطرت پرستی ایک ضمنی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا اصل مقصد اشیائے فطرت کا جایزہ لینا نہیں ہوتا ہے بلکہ اشیائے فطرت کے مطالعہ کے بعد اُن کے ذہن میں کچھ فلسفیانہ خیالات پیدا

ہوتے ہیں۔ انہی خیالات کی عکاسی کرنے کے لیے اقبال کسی منظر فطرت کا ذکر کرتے ہیں۔ اقبال کے یہاں فطرت کی کوئی حسین شئے کسی فلسفیانہ تجزیے کا وسیلہ بن جاتی ہے اور وہ ان روابط پر روشنی ڈالتے ہیں جو فطرت کی شئے اور انسان کے درمیان قایم ہو سکتے ہیں [1]

علامہ اقبال مغرب کے بڑے بڑے فلسفیوں اور شاعروں کے کلام سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ اس کے رمز شناس بھی تھے۔ انگریزوں کے کئی شاعروں کے خیالات کو انہوں نے شعر کی ہی صورت میں اردو میں پیش کیا۔ اس طرح اردو داں طبقہ انگریزی ادب کے گوہر پاروں سے واقف ہو گیا۔ اقبال اپنے ابتدائی دنوں میں جنگلوں کوہساروں اور ندی نالوں کے کناروں پر تنہائی میں بیٹھنے کا شوقین تھا اور یہ انکی فطرت پسندی اور انگریزی کے رومانی شعرا کے اثرات کا نتیجہ تھا۔ مادی دنیا کے نفع اور نقصان اور اس میں انسان کو روزانہ جس کرب ناک صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس سے نجات پانے کے لیے شاعر پہاڑ کی تنہائی میں گھر بنانے اور وہاں نرگس، گلِ لالہ اور بلبل سے ہمسائیگی پیدا کرنے کو فوقیت دیتا ہے۔ وہ جنگلوں اور تنہائیوں کی زندگی کو شہروں کی گہما گہمی اور طمطراق پر قربان کرنا چاہتا ہے۔ ان جذبات کا اظہار اقبال اپنی مشہور نظم "رخصت اے بزم جہاں" میں بڑے ہی دل کش انداز میں کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اپنے آپ کو فطرت کا پیغام رساں تصور کرتے ہوئے ساری دنیا کو فطرت کے آغوش میں سما جانے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ صحرا کی خاموش فضا میں بڑے شوق کے ساتھ قدرت کی حسن کاری کا مشاہدہ کرتا ہے،

ہے جنوں مجھکو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں میں

---

[1]۔ اردو شاعری میں منظر نگاری۔ سلام سندیلوی ص ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس

شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے
اور چشموں کے کناروں پر سلاتا ہے مجھے
علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود
گل کی پتی میں نظر آتا ہے راز ہست و بود [1]

اقبال کی شاعری میں دریاؤں کی تیز گامی، تیز خرامی اور روانی کا متعدد بار ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح جیسے وارڈس ورتھ TINTERN ABBEY میں دریائے وے کے ساتھ اپنی یادوں کا اعادہ کرتا ہے۔ اقبال گنگا، جمنا، راوی، الکبیر، دجلہ، فرات، نیل اور ڈینیوب کا خاص طور پر اس لیے ذکر کرتا ہے کیونکہ ان دریاؤں کے ساتھ دنیا کی تاریخ کے اہم واقعات منسلک ہیں۔ "کنار راوی" کے نام سے جو نظم اقبال نے تحریر کی ہے وہ شاعرانہ مصوری کی بہت ہی دل کش مثال ہے۔ استعارات، تشبیہات اور رمز و کنایہ کے انمول نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں نظم میں اقبال نے ایک کشتی کی روانی کے ساتھ انسانی عمر کو مشابہ کیا ہے۔ اس طرح ایک اخلاقی نکتے کی طرف اپنے قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

وطن دوستی کے جذبے کے تحت اقبال نے کئی نظمیں مختلف موقعوں پر لکھیں۔ چنانچہ ۱۹۰۴ میں "تصویر درد" کے نام سے جو نظم علامہ نے تحریر کی وہ وطنی جذبات سے بھرپور ہے۔

اپنے وطن کی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات سے شاعر کا احساس دل کڑھتا ہے اور وہ اہل وطن کو یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کی ترقی اس بات میں ہے کہ وہ راہ عمل کو اختیار کریں کیونکہ عمل اسلوب فطرت اور آئین قدرت کے عین مطابق ہے۔ تصویر درد اگرچہ وطنی محبت سے سرشار ہے تاہم اس نظم میں شاعر نے پھولوں، رنگوں، چمن زاروں، باغوں، پرندوں اور فطرت کی دیگر کیفیتوں کا

---

[1] علامہ اقبال۔ بانگ درا، ص ۶۴۔ ۶۵۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ یوپی

تذکرہ خوبصورت انداز میں کیا ہے اور اس طرح یہ نظم منظری اعتبار سے اپنی الگ شان پیدا کرتی ہے۔ اقبال نے نظم میں نرگس، گل، قمری، طوطی، عندلیب، چمن، گلستان، برگ گل، گلچیں، باغ آشیانہ، طایر اور بوستان کا خاکہ ایسے کھینچا ہے کہ یہ ساری علامتیں ہماری آنکھوں کے سامنے تصویروں کی طرح آجاتی ہے۔ مثلاً نظم کے آغاز میں اقبال فطرت کے حوالے سے اپنی داستان سرائی یوں کرتا ہے۔ ؎

اڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستان میری
اڑائی قمریوں نے، طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغان میری
ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستان میری
مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں، خزاں، ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

علامہ اقبال کی اکثر و بیشتر غزلیں بال جبریل میں درج ہیں جن میں فطرت نگاری کے شاندار نمونے پڑھنے والے کو مل سکتے ہیں۔ ان میں زندگی کے مسایل اور زمانے کے پیچیدہ حالات کو غزل میں سما کر اقبال مناظر فطرت کا ساتھ ساتھ ذکر بھی کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں منظر نگاری کے نمونے پیش کر کے انسان کی توجہ مختلف حالتوں اور نازک کیفیتوں کی طرف مرکوز کرائی۔ انہوں نے فطرت کے کسی بھی پہلو کو نہیں چھوڑا لیکن

۱۔ علامہ اقبال۔ بانگ درا۔ ص ۴۸۔ ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڈھ

ان کے ہر پہلو میں فلسفیانہ نکتہ کا اظہار ملتا ہے۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار سلام سندیلوی نے اس طرح کیا ہے۔

"اقبال نے فطرت کی مختلف اشیاء کو مجسم کر کے ان سے گفتگو کی ہے۔ انہوں نے بے جان چیزوں کو جاندار تصور کر لیا ہے اور بے زبان اشیاء کو زبان دے دی ہے۔ اقبال کے یہاں اس قسم کی نظموں کی تعداد کافی ہے۔ فطرت نگاری کے سلسلے میں زیادہ تر ان کی نظمیں ایسی ہیں جن میں یا تو انہوں نے بے نطق چیز کو ناطق تصور کر کے اس کی زبان سے کسی فلسفیانہ نکتہ کی تشریح کی ہے اور بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ دونوں بے جان چیزیں جاندار بن کر آپس میں گفتگو کر رہی ہیں اور اقبال کے نقطۂ نظر پر روشنی ڈال رہی ہیں"[1]

پروفیسر کلیم الدین احمد بھی اقبال کے اس نکتے کی طرف اشارہ کر کے لکھتے ہیں۔

"اس راہ سے اقبال ایک دوسری راہ نکالتے ہیں۔ ابر، چاند، تارے کی زبانی اخلاق یا فلسفیانہ مضامین بیان کرتے ہیں یا ابر، چاند تارے میں جان ڈال کر ان کے فرضی جذبات کو شاعری کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ شعاع آفتاب، تبسم اور تارے پہلی قسم کی نظمیں ہیں۔ ہر نظم میں کسی خیال کو شاعرانہ ڈھنگ میں بیان کیا گیا ہے"[2]

اقبال کی ایک نظم جو بہت ہی دل کش اور دل نشین ہے اس کا عنوان ہے "پھول" اس نظم

---

[1] ۔ اردو شاعری میں منظر نگاری، سلام سندیلوی ۴۶۵ - ۴۶۶

[2] ۔ اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ دوم، کلیم الدین احمد ص ۹۹، اردو مرکز پٹنہ ۱۹۵۶ء

میں منظر نگاری کی حسین اور دل کش مثالیں ملتی ہیں۔ بظاہر تو شاعر پھول سے مخاطب ہے لیکن اس کا اشارہ اس انسان سے ہے جس سے دنیا کی عظمت برقرار ہے۔ وہ انسان کا وجود ایسا دیکھنا چاہتا ہے کہ جس سے پھول کی طرح دنیا کی فضا مہک اٹھے، پھول کے چند اشعار یہاں پر قلمبند کیے جاتے ہیں جن سے ہم اقبال کی ان فنی صلاحیتوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں جو اس نے پھول کو مخاطب ہو کر بروئے کار لائی ہیں۔

تجھے کیوں فکر ہے اے گل! دل صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے
تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے
تنک بخشی کو استغنا سے پیام خجالت دے
نہ رہ منت کش شبنم، نگوں جام و سبو کر لے
نہیں یہ شان خود داری، چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے، کوئی زیب گلو کر لے [1]

ان اشعار میں اقبال نے پھول اور بلبل کو جو کہ فطرت کا ایک حصہ ہیں مخاطب ہو کر انسان کو فلسفہ زندگی کا پیغام دیا ہے، پھول سے اقبال کہتا ہے کہ بلبل کے دل صد چاک کو رفو کرنے سے پہلے تجھے اپنے اندر جھانک کر دیکھنا چاہیئے۔ اگر تو باغ میں عزت کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا

---

[1] بانگ درا، علامہ اقبال ص ۲۴۹، ۲۵۰، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ

ہے تو کانٹوں میں الجھ کر بھی تجھے نشیب و فراز طے کرنے ہوں گے اور تو اپنی ایسی ہستی بنا کر مصیبت میں رہ کر بھی آزاد رہ سکے۔ دراصل اقبال پھول کو سامنے رکھ کر اور تصور میں انسان کو لا کر اس کے لیے یہ پیغام دیتا ہے کہ قوم کی اصلاح کے لیے تجھے سب سے پہلے اپنی سیرت کی تکمیل کرنی ہوگی اور اگر تو دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو زندگی کی مصیبتوں کو برداشت کرنے کی عادت پیدا کرلے۔ جو شخص مصیبتوں سے گھبراتا ہے وہ کبھی زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور اگر تو آزادی کا آرزو مند ہے تو تمام فکری و عقلی و قواعد و ضوابط کو بالائے طاق رکھ کر ایسا فضا پیدا کر جس سے کوئی تمہاری آزادی نہیں چھین سکتا۔ اس نظم میں اقبال نے باغ کا تلازمہ ایسے باندھا ہے کہ ہر شعر میں منظر نگاری کی جھلک نظر آتی ہے مثلاً "پھول، گل، چاک، گلزار، کانٹے، صنوبر، آزاد، شبنم، جام و سبو، چمن، گلچیں، غنچہ، رنگ و بو" ان فطری الفاظ کا استعمال بڑے سلیقے سے اقبال نے کیا ہے۔

اقبال کی شاعری اور بالخصوص اس کی منظر نگاری میں جو بات اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ اقبال دل کی دنیا اور خارجی عالم میں بڑی فن کاری کے ساتھ رشتہ جوڑتا ہے وہ اپنے فن کے اشارات کے ذریعے فطرت کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ فطرت کی سرگرمیوں کو سنتا ہے یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اپنے جذبات کو فطرت پر طاری کر دیتا ہے۔ فطرت جو بات اکھڑے اکھڑے طور کہتی ہے اس کو وہ اپنے احساس کی گرمی اور توانائی سے موزوں طریقے سے بیان کرتا ہے۔ وہ اپنے جذب دروں سے حقیقت میں گہرائی پیدا کرتا ہے جو کام فطرت سے نہ ہو سکا۔ اس کی تکمیل فن کار کے ہاتھوں ہو جاتی ہے۔ شاعر اپنے دل سے کہتا ہے کہ تجھے کس چیز کی تلاش ہے کس شے کی ہوس ہے۔ کہا تو نہیں جانتا ہے کہ قدرت اور قدرت کے مظاہر تیرے ہم نفس ہیں اور یہ ساری اشیا اپنا اپنا تعلق تیرے ساتھ قایم کرنا چاہتی ہیں۔

فطرت کے جلوؤں کی رنگا رنگی اور رعنائی فن کار کے دل میں جب اپنا عکس اور اس کے خیالوں اور جذبوں میں حل ہو کر اظہار چاہتی ہے تو اس وقت وہ اپنے وجود کی غرض و غایت کو پورا کرتی ہے۔ فطرت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اہل نظر کو اپنی طرف مایل کرے۔ فطرت اس وقت تک حسن سے عاری رہتی ہے جب تک کہ انسانی نظر اس میں جمال آفرینی نہ کرے۔ شفق کے منظر میں اس وقت دل کشی آتی ہے، جب کوئی صاحب نظر اس کو دیکھ کر پکار اٹھتا ہے کہ کیا خوبصورت منظر ہے۔ اقبال نے فطرت عالم وجود یا اپنے گرد و پیش کو اپنے ساتھ ایسے جوڑ دیا ہے کہ اس میں شوخی فکر سے ایک نزاکت پیدا ہو جاتی ہے اور فطرت کے جلوؤں کی رنگا رنگی اس کے دیدہ بیدار کی رہین منت بنتی ہے۔ ؎

این جہاں چیست صنم خانۂ پندار من است
جلوۂ ادگرد دیدۂ بیدار من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من
چہ زماں و چہ مکاں شوخیٔ افکار من است [1]

اقبال فطرت کی ایک ایک ادا کا رمز شناس اور نکتہ داں ہے۔ کبھی وہ اپنے آپ کو اپنے ارادے کی بدولت اس سے جدا خیال کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ فطرت پر غلبہ اور تصرف حاصل کرے۔ فطرت اس کے مقاصد کا ایک وسیلہ ہے اور وہ اس کی تسخیر میں جس قدر جد و جہد کرتا ہے اسی قدر اپنی شخصیت کی تکمیل کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ کاینات اپنی وسعتوں کے کے اعتبار سے اگرچہ بے پایاں اور بے انتہا ہے لیکن کاینات فطرت اقبال کے خیال میں اس بہت بڑی دولت سے محروم ہے جو انسان کے پاس ہے اور وہ ہے انسان کا ذہنی ادراک، اس کی

---

[1] علامہ اقبال۔ کلیات فارسی۔ ص ۔ ۱۳۰ زبور عجم۔ کتب خانہ نذیریہ اردو بازار

فعال شخصیت اور اس کی باشعور ہستی، فطرت چاہے انسان کو منانے کی قوت رکھتی ہے لیکن وہ اپنی قوت کا شعور نہیں رکھتی۔ اقبال نے اپنے کلام میں متعدد بار اس خیال کو پیش کیا ہے کہ فطرت مجبور محض ہے وہ جیسی ہے بس وہی ہے۔ وہ اپنی طبیعت کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ فطرت کے مقابلے میں انسان کا ذہن مزاحمت کرتا ہے۔ اس میں مقابلے کی صلاحیت ہے وہ اپنے اوپر جبر کی حالت کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتا ہے اور نہ اس کی حیثیت انفعالی ہے۔ انسان اپنی صلاحیتوں کو برتتا اور آزماتا ہے۔ وہ فطرت میں تخیلی طور پر تعریف کرتا ہے۔ جس کی نوعیت تخلیقی ہے۔ بانگ درا میں اقبال نے اس خیال کو مختلف پیرائیوں میں ظاہر کیا ہے وہ جہاں فطرت کے زبردست شیدائی لگتے ہیں وہاں وہ فطرت اور انسان کے درمیان تفاوت اور تضاد کو واضح کر دیتا ہے۔ اس تضاد کو ظاہر کرنے کے پس منظر میں دراصل اس فلسفے کی تائید و توثیق کرنا مقصود ہے جسے اقبال فلسفہ خودی کہتے ہیں۔ اقبال اگرچہ تسلیم کرتا ہے کہ فطرت ہم سے آزاد بھی ہے اور وابستہ بھی لیکن ایک چیز انسان میں ایسی ہے جو اس کو فطرت سے علیحدہ کرتی ہے اور وہ اس کا تاثر و احساس ہے۔ احساسِ ذات اور احساسِ کائنات انسان کے ساتھ وابستہ ایسی حقیقتیں ہیں جن سے فطرت عاری اور کلی طور پر محروم ہے اور انسان زندگی کی اصل حقیقت ہے۔

الغرض علامہ اقبال نے قدرت کے مناظر کا ذکر استعارہ، تشبیہہ، رمز، ایما اور تمام محاسن شعری کا سہارا لیتے ہوئے بڑی چابکدستی کے ساتھ کیا ہے۔ فطرت نگاری میں اقبال کا طرز بیان وصفی یا توصیفی نہیں بلکہ ایمائی اور رمزی ہے اور وہ یا تو منظر کے حسن کے مجموعی تاثر کو سامنے رکھکر خیالی مرقعے بناتے ہیں یا اشیائے فطرت میں مشابہتیں و مماثلتیں تلاش کر کے اظہار خیال میں مدد لیتے ہیں۔ فطرت نگاری کی بنا پر ہی اقبال کو مصورِ فطرت کا لقب دیا گیا ہے۔ اقبال کی فطرت نگاری فطرت پرستی کے مترادف نہیں، وہ حسن فطرت کو انسان اور انسانیت

سے متعلق بصیرتوں کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں. وہ چاہتا ہے کہ انسان کا ذہن حسن فطرت سے مسرت اندوزی کے ساتھ ساتھ کائنات کے اسرار و رموز کے اظہار اور ان کی جستجو کی طرف مایل ہو جائے.

مشتاق احمد گنائی

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کا

تعارف

اور دورِ حاضر میں اس کی اہمیت

دورِ جدید کی تاریخ ساز مسلم شخصیات میں علامہ اقبال کو ایک اہم اور کلیدی مقام حاصل ہے۔ آپ کے فکر و فلسفہ سے عالم انسانیت بالعموم اور عالم اسلام بالخصوص متاثر ہوا ہے، برصغیر کی فکری، فنی، ادبی اور سیاسی تاریخ میں آپ نے انمٹ نقوش چھوڑے اور نئی جہتیں متعین کیں۔ آپ کے فکری نظام کو خودی کے منفرد لفظ سے پہچانا جاتا ہے۔ فکری اظہار خیال کے لیے علامہ نے شاعری کو اپنا سب سے بڑا وسیلۂ اظہار بنایا۔

نثری زبان میں آپ کے خطبات کا مجموعہ یعنی تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ سپاٹ فلسفیانہ زبان میں ہے۔ یہ کتاب اس حیثیت سے بڑی اہم ہے کہ اس میں علامہ نے جدید و قدیم فلاسفہ کے نظریات پر بحث کرتے ہوئے اپنے نظریے کو واضح کیا ہے یہ کتاب ہر اس شخص کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہے جو مسلم فلسفہ کو بالعموم اور ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ کو بالخصوص سمجھنا چاہتا ہو۔ "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" دراصل انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے اور انگریزی میں اس کا نام The Reconstruction of Religious Thought in Islam رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب

سات خطبات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۳۰ء کی پہلی اشاعت میں یہ چھ خطبات یعنی
"Six Lectures on the Reconstruction of Religious Thought in Islam"
کے نام سے چھپ گئی تھی۔ بعد میں اس میں ایک اور خطبے کا اضافہ کیا گیا۔ آخر ۱۹۳۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن سے شایع کی گئی [1]

سید نذیر نیازی نے بزم اقبال لاہور سے اس کتاب کا اردو ترجمہ "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کے نام سے ۱۹۵۸ء میں شایع کیا [2]

تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کا محرک بقول ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ایک مغربی مصنف نکولاس پی اغنیڈز کی کتاب "Mohamadan Theories of finance" کا یہ جملہ ہے:

"As regards the Ijma, Some Hanifites and. The Mutazilites held that the Ijma can repeal The Quran and the Sunnah." [3]

۱۹۲۴ء میں علامہ اقبال نے انگریزی زبان میں الاجتہاد فی الاسلام کے موضوع پر ایک خطبہ تیار کیا اور پھر نظر ثانی کے بعد یہی خطبہ سر عبدالقادر کی صدارت میں منعقدہ ایک تقریب جیسیہ ہال لاہور میں پڑھا گیا۔ مجموعہ خطبات کا چھٹا خطبہ "الاجتہاد فی الاسلام یا Principle of Islam Movement in the structure of اسی تقریر کی ترمیم شدہ صورت ہے [4]۔

اتفاق سے انہی دنوں مدراس کی "مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سودائن انڈیا" نامی تنظیم کی طرف سے علامہ اقبال کو اسلام پر خطبات دینے کی دعوت ملی [5]

علامہ اقبال دراصل موجودہ پرآشوب دور میں اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے متمنی تھے۔ اسی لیے انجمن حمایت اسلام لاہور کے بیالیسویں جلسے میں انہوں نے "اسلامی ثقافت کی روح"

کے موضوع پر ایک مفصل خطبہ دیا تھا۔[6] اس خطبے میں تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے پانچویں خطبے سے متعلق کئی نکات و اشارات ملتے ہیں۔

۱۳، اگست ۱۹۲۴ء کے ایک خط میں ڈاکٹر اقبال محمد سعید الدین جعفری کو لکھتے ہیں:۔

"میں ایک مفصل مضمون انگریزی میں لکھ رہا ہوں۔ وہ مضمون ہے۔

"The Idea of Ijtihad in the law of Islam"[7]

اس خط سے بھی یہی حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے بہت پہلے خطبات کی تیاری شروع کی تھی اور انہی ایام میں انہوں نے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی وساطت سے محمد یعقوب ٹائپسٹ کو بلوایا تاکہ خطبات املا کرائے جائیں۔[8]

علامہ اقبال پہلے مدراس میں چھ خطبات پڑھنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر اس وقت تک ان کے تین ہی خطبے تیار ہو سکے تھے۔ خطبات کی تیاری کے دوران وہ خط و کتابت کے ذریعہ مولانا سید سلیمان ندوی سے بعض مسایل پر تبادلہ خیال جاری رکھے ہوئے تھے اور بعض کتابیں بھی منگائیں تھیں۔[9] ۱۰، دسمبر ۱۹۲۸ء تک صرف تین خطبے تیار ہو سکے تھے۔[10]

بہر حال ۵، جنوری ۱۹۲۹ء کو علامہ اقبال مدراس پہنچے اور ۶، ۵ اور ۷، جنوری یعنی مسلسل تین دنوں میں علامہ نے یہ خطبات کھلے ہال میں مدراس کے اہل علم کے سامنے پیش کئے۔ یہی خطبے پھر بنگلور، میسور اور حیدر آباد دکن کے اجتماعات میں بھی پڑھے گئے۔ اس کے بعد وکالت اور دیگر مصروفیات کے باوجود اقبال سے باقی تین خطبات کی تیاری میں لگ گئے۔ ۴، اگست ۱۹۲۹ء میں ایک خط کے ذریعے ایک دوست محمد جمیل خان کو اس بارے میں لکھتے ہیں کہ،

The courts are closed for Summer vacation, and I am writing down my

remaining three lectures which I hope to finish by the end of october" [11]

ادھر حیدرآباد دکن کے ان تین خطبات سے اقبال کا کافی چرچا ہوا اور علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے بھی اقبال کو خطبات دینے کی دعوت دی گئی۔ اس لیے اب بقیہ تین خطبوں کی تکمیل اور بھی ناگزیر بن گئی تھی۔ ۳ نومبر ۱۹۲۹ء کو ڈاکٹر اقبال نے محمد جمیل خان کو اطلاع بھیجی کہ خطبات مکمل ہو چکے ہیں۔ ۱۸ نومبر ۱۹۲۹ء کو اقبال علی گڑھ پہنچے اور ۱۹ نومبر شام چھ بجے سے اسٹریچی ہال میں خطبات کا آغاز ہوا۔ اس طرح چھ مکمل خطبات پایۂ تکمیل تک پہنچے [12]

اقبال نے یہ خطبات چھ مختلف عنوانات کے تحت حیدرآباد دکن اور علی گڑھ میں پڑھے۔ بعد میں یہ خطبات Aristotelian Society, london oxford university press کے زیر اہتمام طبع ہوئے [13]۔ اس طباعت میں بعض لفظی ترمیمات ہوئیں اور ۱۹۳۴ کی طباعت میں ایک اور خطبہ یعنی "Is Religion possible" والا خطبہ بھی شامل کیا گیا

تشکیل جدید کے ان خطبات کی اساس اسلامی و مغربی فلسفہ پر ہے۔ لہٰذا ہر کسی کے لیے انہیں سمجھنا آسان نہ تھا۔ اسی احساس کے تحت علامہ اقبال نے سید نذیر نیازی کو لکھا تھا کہ:۔

"مجھے اس میں شبہ ہے کہ عام لوگ اس سے مستفیض ہو سکیں گے۔ علماء جنہوں نے خاص طور پر فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے وہ میرا مقصد سمجھ سکیں گے" [14]

سید نذیر نیازی صاحب نے علامہ کی ہدایت پر ہی ترجمے کا کام شروع کیا۔ اس بارے میں وہ خود تشکیل جدید کے مقدمہ میں یوں بیان کرتے ہیں

"۱۹۳۰ء کی گرمیوں میں راقم الحروف لاہور آیا اور حسب ارشاد دوسرے خطبے کے بعض

اجزا کا ترجمہ شروع کیا، حضرت علامہ نے ترجمہ ملاحظہ فرمایا۔ بعض الفاظ اور مصطلحات حتیٰ کہ عبارتوں تک کی اصلاح کی۔ اس موقعہ پر کچھ اور احباب بھی موجود تھے، حضرت علامہ ترجمے کے بارے میں اظہار خیال فرماتے رہے پھر راقم الحروف کو ضروری ہدایات دیں اور فرمایا کہ ترجمہ جاری رکھو" ۱۵

۱۹۵۸ء میں بزم اقبال لاہور سے باضابطہ طور پر نذیر نیازی نے اس کتاب کا اردو ترجمہ بعنوان "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" شایع کیا۔ تشکیل جدید کے پہلے چار خطبات یہ ہیں۔

۱۔ علم اور مذہبی مشاہدات

۲۔ مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار

۳۔ ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا

۴۔ خودی، جبر و قدر و حیات بعد الموت

پہلے چار خطبات میں اقبال نے قدیم تصورات کو عہد حاضر کے تعلق سے دیکھا ہے اور پھر اپنی فکر کے بنیادی تصورات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، متذکرہ بالا چاروں خطبات میں عہد حاضر کی روح اور اس کے تقاضے کا سراغ مل جاتا ہے۔ پانچواں خطبہ اسلامی ثقافت کی روح کے عنوان سے دیا گیا ہے۔ اس میں علامہ نے ایک ایسے مسئلے کو اپنا موضوع بحث بنایا ہے جو اسلامی تصوف کی تاریخ میں کافی نزاعی رہا ہے۔ یعنی ولایت و نبوت کا متعلق۔ اس خطبے میں ڈاکٹر اقبال نے اسلامی ثقافت CULTURE کی روح کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

چھٹے خطبے یعنی الاجتہاد فی الاسلام میں علامہ نے اجتہاد کو اپنا موضوع سخن بناتے ہوئے دورِ حاضر میں اجتہاد کو ایک ناگزیر حیثیت قرار دیا ہے۔

ساتویں خطبے یعنی "کیا مذہب کا امکان ہے" میں اقبال اس بحث کو چھیڑتے ہیں کہ کیا ہمارے دور میں مذہب بروئے کار آسکتا ہے؟

دراصل یہی وہ مسایل ہیں جو نہ صرف امتِ مسلمہ کی تہذیبی و سیاسی ضروریات ہیں بلکہ تمام

بنی نوع انسانیت آج انہی مسایل میں گری ہوئی ہے۔

علامہ اقبال اپنے ان خطبات کو تفکر اسلامی جانتے تھے۔ ان کی رائے میں اگر یہ کتاب خلیفہ مامون الرشید کے دور میں شایع ہوتی تو یقیناً اسلامی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے کا ذریعہ بنتی[16]۔ علامہ نے ان خطبات میں اپنے آپ کو جدید اسلامی علم کلام کے بانی کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اسلام و فلسفہ کے ربط پر جدید نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہوئے فلسفۂ اسلام پر غور و فکر کرنے والوں کو نئی جہتیں دکھائی ہیں۔ یہی وجہ ہے جب ان کے ایک دوست عبدالرحیم ان کو موجودہ زمانے کے پیچیدہ مسایل کے متعلق کچھ اشارات دیتے ہیں تو ان مسایل کے جواب میں اقبال ۱۷ جنوری ۱۹۳۲ء کے ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں کہ

"آپ میرے چھ لیکچرز غور سے پڑھیں۔ اس میں آپ کے تمام سوالات کے جوابات آجاتے ہیں"[17]

ایک پاکستانی ادیب اور سرکردہ اسکالر ڈاکٹر فرمان فتح پوری خطبات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

"خطبات کے موضوعات کا تقاضا ہے کہ ان پر ابھی اور توجہ صرف کی جائے اور تلخیص و تشریح سے آگے بڑھ کر اقبال کے بعد کے پیدا شدہ تہذیبی مسایل کے پس منظر میں انہیں جانچا پرکھا جائے اور ان کی اہمیت کا احساس دلایا جائے"[18]

خود علامہ اقبال خطبات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

وقت کا تقاضا ہے کہ دین کے علم کو جدید حکیمانہ انداز فکر و نظر کے ساتھ پیش کیا جائے۔ میں نے اس تقاضا کو ان خطبات میں ایک حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی فلسفہ اس انداز سے سامنے آئے کہ دین و دانش اور مذہب و سائنس میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے"[19]

علامہ کا دل ملتِ اسلامیہ کے درد سے معمور تھا۔ ۱۹۰۴ء میں وہ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں ایک مقالہ زیرِ عنوان قومی زندگی میں ملتِ اسلامیہ سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:۔

"جس طرح اس وقت ہمیں تائید اصولِ مذہب کے لیے ایک جدید علمِ کلام کی ضرورت ہے اسی طرح قانونِ اسلامی کی تفسیرِ جدید کے لیے ایک بہت بڑے فقیہہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلیہ و نقلیہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلّمات کی بنا پر قانونِ اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب و منظم کر سکے بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اسلامی دنیا میں اب تک کوئی ایسا مقنن پیدا نہیں ہوا اور اگر اس کام کی اہمیت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام شاید ایک سے زیادہ دماغوں کا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے کم از کم ایک صدی کی ضرورت ہے۔"[۲۰]

دراصل اس کام کو وہی اہلِ بصیرت و صلاحیت اشخاص ہی خوش اسلوبی سے نبھا سکیں گے جو قرآن و حدیث اور مشرق و مغرب کے جدید تہذیبی، عمرانی اور فلسفیانہ مسائل پر اقبال کی طرح کامل دسترس رکھنے کے ساتھ ملت کے سچے خیر خواہ ہوں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

In These Lecturs, which were Undertaken at The request of The Madras Muslim Assocration and delivered at Madras, Hyderabad and Aligarh. Thave tried to meet, even Though partially This urgent demand by The attempting to reconstruct Muslim religious

Philosophy with regard to The philosophical tradition of Islam" 21

مغرب کی شعری اور فلسفیانہ روایات پر علامہ اقبال کو پہلے ہی سے گہری آگہی تھی۔ وہ مسلمانوں کی زبوں حالی اور اضمحلال کے خاتمہ کے لیے نئے طرز فکر و عمل کو اختیار کرنے کے خواہاں تھے جو قرآن و سنت کی روح کے مطابق ہو۔ اسی لیے انہوں نے تشکیل جدید کے چھٹے خطبے "الاجتہاد فی الاسلام" میں اجتہاد پر بہت زیادہ زور دیا تاکہ قرآن و سنت کی نئی اور زندہ تشریح و تعبیر کی جائے اور وہ زمانہ جدید کی سیاسی، ثقافتی، عمرانی، تعلیمی اور معاشی تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ انہی تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے انہوں نے تشکیل جدید کے خطبات پیش کیے

سید ظفر الحسن نے علامہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ خطبات ذہنی مائدہ یعنی INTELLECTUAL FEAST ہیں۔ سید صاحب تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کو نہ صرف عظیم اصولوں کی شاندار تشریح قرار دیتے ہیں بلکہ انہیں علمائے وقت کے لیے معنی خیز ذہنی تحریک کا نام دیتے ہیں [۲۲]

خود علامہ ان خطبات کے متعلق کہتے ہیں کہ

"ان خطبات کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفے سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفۂ اسلام کو فلسفہ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے اور اگر پرانے تخیلات میں خامیاں ہوں تو ان کو رفع کیا جائے۔ میرا کام زیادہ تر تعمیر ہی ہے اور اس تعمیر میں میں نے فلسفۂ اسلام کی بہترین روایات کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے"۔ [۲۳]

اقبال نے ان خطبات میں علم اور وحی کی حیثیت، خدا کے وجود پر مغربی متکلمین کے دلائل اور ان کا رد، ہبوطِ آدم، جنت اور جہنم کی اصل حیثیت، انسانی آزادی کی حقیقت اور اس کے حدود، صوفیانہ اور پیغمبرانہ تجربات کی حقیقت اور مقام، اسلام کا حرکی نظریۂ حیات

اور اس کے تقاضے اور مذہب کے امکان و وجود پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ خطبات کے مطالعہ پر یہی حقیقت سامنے آئی ہے کہ اقبال کو اسلامی و مغربی قدیم و جدید فلسفے پر گہری نظر تھی اور انہوں نے کافی گہرائی کے ساتھ الکندی، الفارابی، ابن رشد، رومی، غزالی اور ابن خلدون کے ساتھ ساتھ آئین سٹائن، وائٹ ہیڈ، جان لاک، میک ٹیگرٹ وغیرہ فلسفہ دانوں اور حکمائے اسلام کا مطالعہ کیا تھا۔

علامہ تشکیل جدید کے خطبات کو حاصل زندگی سمجھتے تھے۔ الہ آباد کے ایک طالب علم نے ۱۹۳۱ء میں سوشلزم اور کمیونزم کا مطالعہ کرنے کے بعد علامہ اقبال سے دریافت کیا تھا کہ "تحریکات حاضرہ کے پیش نظر تشکیل عالم کوئی قوت ہوگا یا نہیں"۔ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے انہیں لکھا کہ:

> "اصل میں آپ کے سوالات کے مکمل جواب کے لیے ایک کتاب درکار ہے آپ۔ میرے خطبات (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) جو میں نے علی گڑھ اور جنوبی ہند میں دیے تھے مطالعہ کیجیے، وہ شایع ہو چکے ہیں۔ مذہبی مسایل بالخصوص اسلامی مذہبی مسایل کے فہم کے لیے ایک خاص تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں کی نئی پود اس سے بالکل کوری ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تعلیم کا تمام تر غیر دینی ہو جانا اس مصیبت کا باعث ہوا ہے"[۲۴]

تشکیل جدید کے یہ خطبات جب کتابی شکل میں شایع ہوئے تو مسلمان مفکرین اور فلاسفر نے ان خطبات کو فکر اسلامی کی تشکیل نو میں اس موضوع پر لکھی جانے والی سب سے اہم اور بہترین تصنیف قرار دیا۔ اس سلسلے میں ایک نامور ادیب اور اقبالیات کے اسکالر ڈاکٹر سید حسین جعفری کہتے ہیں کہ:۔

"تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ اقبال کی مذہبی فکر کی سب سے زیادہ مربوط اور مدلل فلسفیانہ کوشش ہے کہ اس میں انہوں نے قرآن و سنت سے براہِ راست رہنمائی حاصل کرتے ہوئے اور اسلام کے صدرِ اول کو بنیاد بناتے ہوئے فکرِ اسلامی کو اپنے عصری تقاضوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے" ۲۵

علامہ کے خیال کے مطابق مذہبی تعلیمات کو جدید علوم و فنون کی مدد سے نفسیاتی اور فلسفیانہ طور پر پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے خطبات دینے کی اصلی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "....ان حالات میں مذہبی حقایق کی سائنٹفک تعبیر قدرتی معلوم ہوتی ہے..... ان خطبات میں میں نے اسلام کی فلسفیانہ روایات اور انسانی علم کے مختلف شعبوں میں پیش آنے والی حالیہ ترقیوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے مذہبی فلسفہ کی تشکیل جدید کی جزوی طور کوشش کی ہے۔ موجودہ دور (دورِ حاضر) اس کام کے لیے بالکل سازگار ہے"۔ ۲۶ علامہ کے خیال کے مطابق جدید طبعیات نے قدیم طبعیات کے بنیادی نظریات رد کئے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مادیت کا خاتمہ ہو رہا ہے اور یہ اپنی اصل شکل میں ہمارے سامنے نہیں رہا ہے اور اب سائنس مذہبی حقایق کو تسلیم کرنے لگی ہے۔ اسی لیے وہ اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: "اب وہ دن دور نہیں ہے جب مذہب اور سائنس ان مشترک امور ..... اور ہم آہنگی کا سراغ لگائیں گے جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل رہے ہیں"۔ ۲۷۔ اپنے افکار و نظریات کو علامہ حرفِ آخر نہیں سمجھتے ہیں بلکہ ان کے خیال میں علمی ترقی کے ساتھ ساتھ نئے نئے افکار و نظریات وجود میں آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ:

"فلسفہ میں کوئی چیز قطعی نہیں ہے اور آزادئ رائے کا حق ہر ایک

کو حاصل ہے. میرے پیش کردہ نظریات سے ممکن ہے بہتر اور مناسب
نظریات پیش کیے جائیں. ہمارا فرض ہے کہ ہم فکر انسانی کی روز افزوں
ترقی کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہوئے آزادانہ تنقید کا طریقہ اختیار کریں" ۲۸

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ اس لحاظ سے بھی ایک عظیم شاہکار ہے کہ اس میں علامہ نے موجودہ زمانے کے اہم افکار کو اسلامی حکمت و تدبر کے حوالے سے اور اسلامی حکمت کے کچھ نمایاں مسائل کو مغربی افکار کی روشنی میں دیکھا ہے۔ اس بارے میں وہ خود اسی کتاب میں بیان کرتے ہیں کہ:

"میرا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی فلسفہ اس انداز میں پیش کیا جائے کہ اسلام کی فلسفیانہ روایات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے اور انسانی افکار کے جدید انکشافات اور اختراعات سے بھی ثبوت مہیا کئے جائیں. ہمارا فرض ہے کہ فکر انسانی کے ارتقا پر نظر رکھیں اور آزادانہ تنقیدی اسلوب قایم کریں". ۲۹

اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اقبال کے یہ خطبات اسلامی و مغربی حکمت کا نچوڑ ہیں اس لیے کہ ان کا مواد اور اسلوب بیان بالکل اصطلاحی نوعیت کا حامل ہے. کیونکہ ان خطبات میں ہر بات علم کی اصطلاحوں میں ایک معین سائنسی اسلوب میں ادا ہوئی ہے. ان وجوہات کی بناء پر خطبات کی تشریح و توضیح کوئی آسان کام نہیں ہے. اسی لیے سید وحید الدین صاحب تشکیل جدید کی اہمیت و افادیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اقبال خطبات میں بحیثیت ایک مفکر سامنے آتے ہیں. اس لیے ان کی فکر کا منصفانہ جایزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کو اسی معیار سے جانچیں، جس سے انہوں نے اپنے پیشرو مفکرین کا جایزہ لیا ہے" ۳۰

پروفیسر وحیدالدین صاحب کے اس بیان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کی نوعیت مکمل طور پر علمی اور فلسفیانہ ہے۔ افکار و نظریات اسلامی کی تشکیل جدید کے سلسلے میں ان خطبات کی اہمیت و افادیت کو ہرگز نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایس ایم عمر فاروقی کہتے ہیں کہ:

"اقبال اس کتاب کو یعنی تشکیل جدید کو ایک فراموش شدہ پیغمبر کی کتاب کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے جس کی مثال ان کے خیال میں عہدنامہ عتیق و جدید اور نطشے کے THUS SPOKE ZARTASHRA میں نظر آتی تھی۔" ۳۱

تشکیل جدید کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ دورِ حاضر کے سائنسی و فلسفی علوم کی روشنی میں یہ اسلام کی شرح نو ہے۔ یہ کتاب قرآن مجید کے رازوں سے مملو ہیں۔ یہ درونِ میخانہ کے راز ہیں ۳۲

سید ابوالاعلیٰ مودودی خطبات کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"یہ خطبات ایک ایسے زمانے میں تحریر کئے گئے تھے جب کہ اسلامی فکر و نظر اور نظر اور دستور حیات پر مغرب کی یلغار نے دنیائے اسلام میں بڑی انقلاب انگیز شکل اختیار کرلی تھی اور اس پر ایک ہلچل برپا تھی۔ اس وقت جو ابتدائی کوششیں اسلامی عقیدے اور نظام فکر و عمل کو از سر نو مرتب کرنے کیلئے کی گئیں ان میں علامہ مرحوم کے ان خطبات کا بڑا اہم مقام ہے۔" ۳۳

علامہ اقبال نے دراصل محسوس کیا تھا کہ مغربی تہذیب و تمدن کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کو روکنے کے لیے جدید ذرائع و وسایل کی ضرورت ہے اور آپ کو اس بات کا احساس تھا کہ اسلام ایک انقلابی تحریک ہے اور یہ نظام حیات پر زمان و مکان کیلئے قابل عمل ہے۔ لیکن برسوں کے جمود و انجماد نے مسلمانوں کے قلوب کو مضمحل کرلیا تھا لہذا اب ان کے خیال میں ضرورت اس بات کی تھی

کہ اسلام کو جدید فکر و انداز میں پیش کیا جائے تاکہ ایک اور بار یہ سسکتی ہوئی انسانیت کے دلوں و دماغوں کو اپنی ضیا پاشی سے منور کرے۔ چنانچہ تشکیل جدید کے ان خطبات سے اقبال نے اسلامی روایتِ فکر کا احیا کرنے کی زبردست کوشش کی ہے۔ اپنے چھٹے خطبے "الاجتہاد فی الاسلام" میں انہوں نے اسی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے کہا ہے کہ:

"انفرادی اجتہاد کے مقابلے میں شورائی اجتہاد زیادہ بہتر ہے۔ دور جدید میں اجتہاد کی یہی شکل سب سے زیادہ موزوں ہوگی۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم اپنے نظام قانون کو جمود و تعطل سے نجات دلا کر اس میں زندگی کا نیا خون دوڑا سکیں" ۳۴

علامہ کے نزدیک سب سے ضروری کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا احیا اور اسلامی قوانین کا نفاذ ہے۔ اسی لیے ان کا خیال ہے کہ ایک قانون ساز مجلس بیٹھے جو اپنی فکری کوششوں سے ایک جدید اسلامی ریاست کے لیے اسلامی قوانین مرتب و مدون کرے۔ ان کی یہ دیرینہ آرزو رہی ہے کہ فقہ اسلامی کی تدوین جدید ہو۔ اس سلسلے میں وہ خطبات میں کہتے ہیں کہ:

"اگر ہم اسلامی فکر میں کوئی صحت مند اضافہ نہیں کر سکتے ہیں تو کم از کم صحت تنقید سے عالم اسلامی میں امنڈتے ہوئے تجدد پسندی کے سیلاب کو ضرور روک سکتے ہیں" ۳۵

اس طرح وہ مفصل طور پر موجودہ سائنسی دور میں اسلام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نئی نئی سمتوں کی جانکاری دلاتے ہیں۔ عالم اسلام میں آج جو ہر طرف سے اجتہاد کی اہمیت و افادیت کا احساس بڑھ رہا ہے یہ سب اصل میں علامہ اقبال ہی کی کوششوں کا ثمر ہے۔ سعید اکبر آبادی صاحب بالکل بجا لکھتے ہیں کہ:

"عالم اسلام میں اس وقت اسلامی قوانین کی تدوین جدید کیلئے جتنی انفرادی اور

اجتماعی کوششیں ہو رہی ہیں ، یہ سب دراصل اقبال کے خواب کی تعبیریں ہیں
اس لیے اگر آج وہ زندہ ہوتے تو اس پر مسرور ہونے کا حق ان سے زیادہ اور
کسے ہوتا" ۳۶

*

حاشیے

۱۔ نیرنگ خیال اقبال نمبر ۱۹۳۲ء ص ۳۴۵ اور مقدمہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ب ج

۲۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ۔ مقدمہ ص ۱۱

۳۔ Aghanids, Nicdas P. Muhammadan Theories of Finance Reprint Lahore 196 – P-88-
یعنی مسلمانوں کے نظریات مالیات ۔ یہ کتاب ۱۹۵۸ میں کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں شایع ہوئی ، یہ کتاب خاص طور پر اقبال کے لیے امریکہ کی مسلم ایسوسی ایشن کے صدر چودھری رحمت علی نے بھیجی تھی یہی کتاب اقبال کی شہرہ آفاق تصنیف تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کی محرک ہیں ، بحوالہ زندہ رود ۔ جاوید اقبال ۔ ص ۳۴۳

۴۔ خود اقبال نے Reconstruction - P. 145 میں اس کا ترجمہ "The principle of Movement in the principle of Islam" کیا ہے اور تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں نذیر نیازی نے اس کا ترجمہ "الاجتہاد فی الاسلام" کیا ہے ۔ ص ۱۴۶

۵۔ اقبال نے یہاں اپنے یہ چھ خطبات تحریری صورت میں دیئے ۔

۶۔ یہ سالانہ جلسہ ۱۶ اپریل ۱۹۲۷ء میں ہوا تھا ۔

۷۔ اوراق گم گشتہ ۔ ص ۱۱۸

۸۔ اقبال نامہ دوم ۔ ص ۲۳۳ ۔ محمد یعقوب لدھیانہ کا باشندہ تھا وہ ظفر اللہ خان اور ڈالنگ کا

سینٹو بھی تھا۔

۹۔ اقبال نامہ اول۔ ص ۱۵۲ تا ۱۵۸

۱۰۔ اقبال نامہ ــــ ص ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۷

۱۱۔ ایضاً ــــ ص ۳۳۷

۱۲۔ اقبال کی صحبت میں۔ ۳۱۹ تا ۳۴۲

"نقوش" اقبال نمبر اول ۱۹۷۷۔ ص۔ ۵۵۵۔ ۵۶۷

۱۳۔ LETTERS OF IQBAL P NO ۱۱۹

۱۴۔ مکتوبات اقبال۔ ص ۱۲۱

۱۵۔ ۱۹۳۰ء کی نسخہ اول کی اشاعت میں چھ خطبے شامل تھے لیکن اس دوسرے میں سات۔

مزید تشریح کے لیے دیکھئے" مقدمہ تشکیل جدید"۔ ص ۵

۱۶۔ مکتوبات اقبال۔ ص ۴۴ "مقدمہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" ص۔ ۶

۱۷۔ انوار اقبال۔ ص ۲۲۵

۱۸۔ "اقبال سب کے لیے" ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ ص ۴۶

۱۹۔ Preface in The Reconstruction of Religous Thought in Islam – P. No – (VI)

۲۰۔ مقالات اقبال" شیخ اشرف لاہور ۱۹۶۳۔ ص۔ ۵۵

۲۱۔ Preface in Reconstruction of Religous Thought in Islum – P. No – (VI)

۲۲۔ صحیفہ جنوری ۷۷ء، خطبات اقبال کا پس منظر از سمیع اللہ۔ ص ۱۳۲۔

۲۳۔ نیرنگ خیال۔ ص ۵۰

۲۴۔ اقبال نامہ۔ مرتبہ شیخ عطا اللہ۔ ص ۲۵۹

۲۵۔ فکر اسلامی کے ارتقاء کا ایک تاریخی جایزہ "ماخوذ فکر اسلامی کی تشکیل جدید ص ۱۷۔ ڈاکٹر سعید حسین جعفری۔

۲۶۔ دیباچہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ص ۴۰

۲۷۔ دیباچہ تشکیل جدید ص ۳۹

۲۸۔ دیباچہ ص ۴۰۔ ۳۹

۲۹۔ دیباچہ ص ۳۹

۳۰۔ تفکر اقبال سید وحید الدین ص ۹

۳۱۔ طواسین اقبال۔ ایس۔ ایم۔ عمر ناردق ص۔ ط۔ ج۔ ی

۳۲۔ ؎ مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں محرم راز۔ درونِ میخانہ ہوں۔

۳۳۔ مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی حصہ اول ۵۴۔ ۵۵

۳۴۔ خطبہ الاجتہاد فی الاسلام ص۔

۳۵۔ خطبات اقبال پر ایک نظر۔ سعید اکبر آبادی

★

سید شبیر احمد

کلامِ اقبالؔ کے چند اعلام و مشاہیر

ایک جائزہ

علامہ اقبال کے فکر و فن پر اس قدر کام ہوا ہے کہ بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ شاید ہی کوئی پہلو بچا ہو جس پر ماہرینِ اقبالیات نے توجہ نہ کی ہو۔ تاہم اب بھی کچھ ایسے پہلو بچے ہیں جن پر کام کرنے کی گنجایش باقی ہے۔ اسی نوعیت کا ایک موضوع "کلام اقبال کے اعلام و مشاہیر" بھی ہے اس موضوع پر اگرچہ چند ایک متفرق مضامین ضرور لکھے گئے ہیں، جن میں اقبال اور مشاہیر (مرتبہ طاہر تونسوی) کے مضامین کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس کتاب میں تمام مشاہیر کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔

کلام اقبال کے اعلام و مشاہیر جیسے موضوع کو اقبالیات کے مطالعے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے ان اعلام و مشاہیر کے بارے میں تفصیلات حاصل کرنے میں کلام اقبال کے طالب علموں کو کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے بدقسمتی سے ابھی تک کوئی اقبال انسائیکلو پیڈیا بھی مرتب نہیں ہوا ہے۔ البتہ ملک حسن اختر کا دائرۃ معارف اقبال اگرچہ دستیاب بھی ہے مگر اس کے اختصار کے باعث اس کی افادیت بہت ہی محدود ہے۔

اقبال نے اپنے کلام میں دنیا کی عظیم المرتبت شخصیات کا ذکر کیا ہے۔ ان شخصیات

کا تعلق شعروادب، تاریخ، فلسفہ، مذہب اور دیگر شعبوں سے رہا ہے ان شخصیات کا ذکر اقبال نے ضرور کسی نہ کسی وجہ سے کیا ہے۔ کچھ شخصیات سے اقبال کے گہرے مراسم رہے ہیں۔ کئی بلند پایہ شخصیات کی غیر معمولی شعری صلاحیتوں، علم و فضل اور ناقابل فراموش خدمات کے پیش نظر علامہ اقبال نے انہیں اپنی نظموں میں خراج عقیدت پیش کیا ہے اس کے علاوہ کئی شخصیات کے سانحۂ ارتحال پر اقبال نے پُر درد مرثیے لکھے ہیں۔ اور بعض پر قطعات تاریخ بھی کہے ہیں۔ بعض شخصیات نے اقبال کی شخصیت کے تعمیر و تشکیل میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے، جن کا ذکر بھی اقبال نے کافی عقیدت سے کیا ہے۔ غرض ایسے بہت سے اعلام و مشاہیر ہیں جن کا ذکر کلام اقبال کے علاوہ اقبال کے خطوط میں بھی نہایت ہی عقیدت اور احترام سے ملتا ہے۔ ان شخصیات کا تعلق مختلف شعبوں سے رہا ہے۔ ان ہی شخصیات میں مرزا غالب کی عظیم المرتبت شخصیت بھی شامل ہے۔

اقبال نے غالب کا ذکر اپنے اردو اور فارسی کلام کے علاوہ اپنے خطوط میں بھی نہایت ہی احترام سے کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میری رائے میں مرزا غالب کا فارسی کلام مسلمانان ہند کی طرف سے وہ واحد پیش کش ہے جس سے ملت کے عام ادبی سرمائے میں کوئی مستقل اضافہ ہوا ہے۔ غالب یقیناً ان شعراء میں سے ہیں، جس کا ذہن اور تخیل انہیں مذہب اور قومیت کے تنگ صدور سے بالاتر مقام عطا کرتا ہے۔ غالب شناسی کا حق ادا ہونا باقی ہے" [1]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"بیدل اور غالب نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو

---

[1] شذرات فکر اقبال ۔ ص ۱۰۲

لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھ سکوں"۔ [1]

اقبال غالب کو صرف ایک شاعر ہی نہیں مانتے بلکہ ایک بلند پایہ مفکر بھی تصور کرتے ہیں،

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

"بانگ درا" کی نظم "مرزا غالب" میں غالب کے تخیل کی بلند پروازی اور فکر کی بلندی کے علاوہ غالب کے اعجاز سخن کا اعتراف یوں کیا گیا ہے۔

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر

غالب کی عظمت بیان کرتے ہوئے سرزمین دہلی سے اقبال یوں سوال کرتے ہیں۔

دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

اردو کلام کے علاوہ اقبال نے فارسی کلام میں بھی غالب کی عظمت بیان کی ہے چنانچہ "جاوید نامہ" میں غالب منصور حلاج اور قرۃ العین کا ذکر یوں کیا ہے

غالب و حلاج و خاتون عجم
شورہا افگندہ در جان حرم
ایں نوا ہا روح را بخشد ثبات
گرمی او از درون کائنات

مرزا غالب کے علاوہ اقبال نے اپنے استاد داغ کا ذکر بھی اپنے کلام اور خطوط میں کافی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ اقبال داغ کے شاگردوں میں تھے اس لیے اقبال زندگی بھر ان کے

---

[1] تشذرات فکر اقبال — مرتب ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال، لاہور ۱۹۷۳ — ص ۱۰۵

مداح رہے۔ اقبال کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ داغ کے شاگردوں میں سے ہیں۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ سخنداں پر

اقبال کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ ان کی تربیت میں داغ کا خاصا حصہ ہے۔

جناب داغ کی اقبال پہ ساری کرامت ہے
تیرے جیسے کو کر ڈالا سخنداں بھی سخنور بھی

داغ پر لکھے گئے مرثیے میں اقبال نے اپنی عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے:

اب کہاں وہ بانکپن وہ شوخیٔ طرزِ بیاں
آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں
اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی روئے خاک دلی دانے کو رد تا ہوں میں

اقبال کو داغ کو شاعری میں ایک ایسی خوبی نظر آتی جو دیگر شعرا کے یہاں ناپید ہے۔

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

اقبال نے داغ کی شاعرانہ خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے دنیا کی بے ثباتی کا ذکر یوں کیا ہے۔

ایک ہی قانون عالم گیر کے ہیں سب اسیر
بوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

شاعری کے علاوہ اقبال نے داغ دہلوی کا ذکر اپنے خطوط میں بھی کیا ہے چنانچہ اقبال نے احسن مارہروی کے نام ایک خط میں داغ کا ذکر یوں کیا ہے:

"دونوں رسالے پہنچے۔ سبحان اللہ! نواب صاحب کی غزل کیا مزے کی

ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک میں نے آپ کے گلدستے کو کوئی غزل نہیں بھیجی۔
اِنشاءاللہ امتحان کے بعد باقاعدہ ارسال کروں گا۔ ایک تکلیف دیتا ہوں اگر
آپ کے پاس استاد ذی حضرت داغ کی تصویر ہو تو ارسال فرمائے گا۔ بہت
ممنون رہوں گا۔ اگر آپ کے پاس نہ ہو تو مطلع فرمائے گا کہ کہاں سے مل سکتا ہے
میں نے دنیا کے تمام بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کیے ہیں۔ چنانچہ انگریزی
جرمنی اور فرنچ شعراء کے فوٹوں کے لیے امریکہ لکھا ہے غالباً کسی نہ کسی استاد بھائی
کے پاس حضرت کا فوٹو ضرور ہو گا۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو ازراہ عنایت مطلع فرمائے
حضرت امیر مینائی کے فوٹو بھی ضرورت ہے۔ والسلام" [1]

داغ دہلوی کے علاوہ اقبال نے اپنے استاد سید میر حسن سیال کوٹی کا ذکر بھی کافی عقیدت سے کیا ہے۔
سید میر حسن نے اقبال کی زندگی کے تعمیر و تشکیل میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس بات کا اعتراف اقبال
نے خود بھی کیا ہے۔ میر حسن نے اقبال کی زندگی کو چار چاند لگائے۔ ان حضرات کی وجہ سے ہی اقبال کو
بچپن میں ہی ایک ایسی مستحکم بنیاد فراہم ہوئی جو ساری عمر قایم رہی۔ اس بارے میں سر عبدالقادر لکھتے
ہیں:

"اقبال معترف ہے کہ جس مذاق کی بنیاد سید میر حسن نے ڈالی اور جسے درمیان
میں داغ کے غائبانہ تعارف نے بڑھایا تھا اس کے آخری مرحلے آرنلڈ کی شفیقانہ
رہبری سے طے ہوئے" [2]

مولوی میر حسن اقبال کو کافی پسند کرتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ علاوہ نے بازار سے گھر کے لیے

---

[1] اقبال نامہ۔ ص ۴۰۳۔ جلد اول۔ شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۵۱ء
[2] سر عبدالقادر ــــ دیباچہ مشمولہ۔ کلیات اقبال۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ ۱۹

کچھ سامان لایا، مولانا کو ناگوار ہوا اور کہا۔

"تمہیں کتنی بار کہا کہ بازار سے ہمارے لیے سودا سلف مت لایا کرو تم میرے شاگرد ہو نوکر نہیں"

علامہ نے مسکرا کر کہا "جناب میں آپ کا شاگرد نوکر ہوں"

اقبال نے اپنے خطوط اور کلام میں اس عظیم المرتبت شخصیت کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ محمد بن عبدالرحمان شاطر مدراسی کے نام لکھتے ہیں:

"اگر آپ اعجاز عشق میرے کسی دوست کے نام ارسال کرنا چاہیں تو حضرت مولوی سید میر حسن صاحب پروفیسر عربی، سکاچ مشن کالج سیال کوٹ کے نام ارسال کیجیے یہ بڑے بزرگ ہیں، عالم اور شعر فہم ہیں میں نے انہی سے اکتساب فیض کیا ہے"[2] اقبال اکثر کہا کرتے تھے کہ اسوہ رسولؐ پر صحیح معنوں میں اگر کسی شخص نے عمل کی ہے تو وہ مولوی سید میر حسن سیال کوٹی ہیں۔

جب علامہ اقبال کو گورنمنٹ کی طرف سے سر کا خطاب ملا تو انہوں نے اس بناء پر یہ خطاب قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ مولانا سید میر حسن کو بھی شمس العلما کا خطاب ملنا چاہیے۔

میر حسن کا انتقال ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو ہوا، علامہ کو میکلوڈ والے مکان سے خبر ملی، ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑے سیال کوٹ کی کوئی گاڑی نہ تھی، مال گاڑی وزیر آباد جا رہی تھی، علامہ اسی میں چلے گئے

۱۔ غلام رسول مہر شمس العلماء سید میر حسن کا انتقال، نقوش اقبال نمبر ۲ ــ ص ۶۴۹

۲۔ خطوط اقبال ــ شیخ عطا اللہ ص ۷۳

اپنے کلام میں میر حسن کا ذکر یوں کیا ہے:

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

"بانگ درا" میں التجائے مسافر عنوان کے تحت ایک نظم لکھی ہے اس نظم میں اقبال نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ سارا فیض انہیں خاندان مرتضوی سے ہی نصیب ہوا

وہ شمع بارگاہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستان مجھکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ ہے کہ خداوند آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھکو

دوسرا فکری اور تعمیری ماحول انہیں خاندان مرتضوی کی بارگاہ کے آستانہ علم و دانش سے ملا جو اقبال کے لیے مثل حرم ہے جس کے نفس سے اقبال کی آرزو کی کلیاں کھلی ہیں۔ جس کی مروت نے اقبال کو نکتہ داں اور نکتہ سنج بنا دیا [1]

فارسی زبان و ادب کی جن عظیم المرتبت شخصیات کلام اقبال میں ملتا ہے ان میں غنی کاشمیری کا ذکر بھی کافی احترام سے ملتا ہے دونوں عظیم شخصیات کا تعلق ملک کشمیر سے رہا ہے۔ اس لیے دونوں شخصیات کو اس قوم سے کافی ہمدردی تھی دونوں نے کشمیری قوم کے درد کو کافی محسوس کیا۔

---

[1] ڈاکٹر عبدالحق اقبال کے ابتدائی اذکار ۷۰-۶۹
حمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۹ء۔

ہم چوں سوزن دایم از پوشش گریزانیم ما
جامہ بہر خلق می دوزیم و عریانیم ما
روزی ما میشود آخر نصیب دیگراں
طالع برگشتہ، ہمچوں آسیا داریم ما (غنی)

بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تارے (اقبال)

پیام مشرق میں غنی کے عنوان سے ایک نظم ملتی ہے جس میں غنی کی گوشہ نشینی، استغنا اور فقر کا اظہار یوں کیا گیا ہے

غنی آن سخن گوئے بلبل صفیر — نوا سنج کشمیر مینو نظیر
چوں اندر سرا بود دربستہ داشت — چو رفت از سرا تختہ را واگزاشت
یکے گفتش اے شاعر دل رسے — عجب دارد از کار تو ہر کسے
بہ پاسخ چہ خوش گفت مرد فقیر — فقیرو۔ باقلیم معنی امیر
زمیں آنچہ دید ند یاراں رواست — درین خانہ جز من متاعے کجاست
غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش — متاعے گرانے است در خانہ اش

چو آں محفل افروز در خانہ نیست
تہی تر ازیں، ہیچ کاشانہ نیست

جاوید نامہ میں غنی کو جنت الفردوس میں حضرت میر سید علی ہمدانی کے حضور میں نغمہ خواں دکھایا ہے۔

شاعر رنگین نوا طاہر غنی — فقر اور باطن غنی ظاہر غنی
نغمۂ می خواند آں مست مدام — در حضور سید والا مقام
سید السادات سالار عجم — دست او معمار تقدیر امم

کشمیر کی گذشتہ عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

در زمانے صف شکن ہم بودہ است

چیرہ و جانباز و پردم بودہ است

عمر ہا گل رخت بربست و کشاد

خاک ما دیگر شہاب الدین نژاد

کشمیر کے سیاسی حالات کا نقشہ کھینچ کر اقبال نے بزبان غنی اپنے خیالات یوں پیش کئے ہیں

باد صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی

حرفے زما بہ مجلس اقوام باز گوے

دہقان و کشت و جوے و خیابان فروختند

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

کشمیر کی سیاسی حالت پر تنقید کرنے کے بعد علامہ کہتے ہیں کہ کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسری قوم کا سودا کرے ان حالات میں بھی اقبال پرامید ہیں کہ کشمیر جیسی باغیرت قوم اور ہنرمند قوم کبھی غلام نہیں رہ سکتی۔ اقبال کے مطابق جن برہمن زادوں نے ہندوستان کو ذوق آزادی عطا کیا وہ کشمیر ہی کے باشندے تھے

ہند را آں ذوق آزادی کہ داد	صید را سودائے صیادی کہ داد
آں برہمن زادگانِ زندہ دل	لالۂ احمر ز روے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش	از نگاہ شاں فرنگ اندر خروش
اصل شاں از خاک دامن گیر ماست	مطلع ایں اختراں کشمیر ماست

غنی اقبال سے کہتے ہیں۔

کار و ا ہنما از صدا تو درا	تو ز اہل خطہ نومیدی چرا؟

اس حوصلہ افزائی کے بعد غنی اقبال کو اتفاق و اتحاد کا درس دیتے ہیں کیونکہ اتفاق اور اتحاد سے ہی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

غنی کاشمیری کے علاوہ فارسی زبان و ادب کی ایک اور عظیم شخصیت حکیم سنائی کا ذکر بھی کلام اقبال میں نہایت ہی عقیدت سے ملتا ہے، حکیم سنائی کی عظمت کا اعتراف کلام اقبال کے فارسی اور اردو حصہ میں بھی ملتا ہے اس کے علاوہ اقبال کے خطوط میں بھی سنائی کا ذکر ملتا ہے۔

"افکار پریشاں" کے عنوان سے "بال جبریل" میں اقبال نے ایک نظم لکھی ہے جو سنائی کے ایک قصیدے کی پیروی میں لکھی گئی ہے یہاں علامہ نے رومی کے اس شعر کو نظم کیا ہے۔

"ما از پئے سنائی و عطار آمدیم"

اور اس نظم میں سنائی کے قصیدے سے علامہ نے یہ شعر لیا ہے

جو علمت ہست خدمت کن چو دانایاں کہ زشت آید
گرفتہ چینیاں احرام و سکی خفتہ در بطحا

علامہ نے اس شعر کا آخر مصرعہ یوں درج کیا ہے

ندا آئی کہ آشوب قیامت سے یہ کیا کم ہے
گرفتہ چینیاں احرام و سکی خفتہ در بطحا

اس نظم کا آخر شعر یہ ہے:

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا

نادر شاہ کی دعوت پر علامہ کے ساتھ سر راس مسعود سید سلیمان ندوی بھی افغانستان کے دورے پر گئے وہاں اقبال نے حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کی اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"علامہ نے جب غزنی میں مزار سنائی کی زیارت کی تو فرطِ جذبات سے زار و قطار رو پڑے اور بے خود ہو گئے" [1]

اس بات کا ذکر علامہ نے خود بھی کیا ہے

در فضائے مرقداو سوختم، تا متاع نالۂ اندوختم

حکیم سنائی کا ذکر اقبال پروفیسر اکبر منیر کے نام ایک خط میں یوں کرتے ہیں۔

"حکیم سنائی اور مولانا روم کو زیرِ نظر رکھنا چاہیئے۔ اس قسم کے لوگ اقوام و ملل کی زندگی کا اصلی راز ہیں۔ حکیم سنائی سے طرزِ ادا سیکھنا چاہیے کیونکہ مطالب عالیہ ادا کرنے میں ان سے بڑھ کر کسی نے قدم نہیں رکھا" [2]

ارمغان حجاز میں سنائی کا ذکر یوں کیا گیا ہے "عطا کن صدق اخلاص سنائی"

مثنوی مسافر میں حکیم سنائی کا ذکر کافی عقیدت سے کیا ہے۔

خفتہ در خاکش حکیم غزنوی

از نوائے او دل مرداں قوی

آں حکیم غیب آں صاحب مقام

ترک جوش رومی از ذکرش تمام

آگے لکھتے ہیں؛

اے حکیم غیب امام عارفاں — پختہ از فیض تو خام عارفاں

آنچہ اندر پردۂ غیب است گوئے — بو کہ آب رفتہ باز آید بجوئے

---

[1]۔ بشیر احمد ڈار — سنائی اور اقبال نقوش اقبال نمبر ۳ ستمبر ۱۹۷۷ ص ۶۰۔

[2]۔ اقبال نامہ — جلد دوم ص ۱۶۲

اقبال حکیم سنائی سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں اسرار غیب سے آگاہ کریں چنانچہ حکیم سنائی کی روح بہشت بریں سے جواب دیتی ہے۔

راز دان خیر و شر گشتم ز فقر — زندہ و صاحب نظر گشتم ز فقر
یعنی آں فقرے کہ داند راہ را — بیند از نور خودی اللہ را
اندرون خویش جوید لا الہ — در تنِ شمشیر گوید لا الہ
می ندانی عشق و مستی از کجاست — ایں شعاع آفتاب مصطفیٰ است
باخبر شو از رموز آب و گل — پس بزن بر آب و گل اکسیر دل

سنائی اقبال کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ تم قوم کی پستی سے پریشان نہ ہو یقین رکھو حالات سازگار ہو جائیں گے اور مسلمانوں کی عظمت لوٹ آئے گی۔

باش تا بینی بہار دیگرے — از بہار بوستان رنگیں ترے
لالہ را در وادیٔ کوہ و دمن — از دمیدن باز نتوان داشتن

کلام اقبال میں فارسی زبان و ادب کے جن اعلام و مشاہیر کا ذکر کیا گیا ہے ان میں مولانا جلال الدین رومی کا ذکر بھی کافی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اقبال سب سے زیادہ رومی سے ہی متاثر تھے۔ اقبال نے اسی لیے اپنے مرشد اور اس مرد مومن کا ذکر اپنے کلام میں کافی عقیدت سے کیا ہے علامہ اقبال کو رومی کی مثنوی کافی پسند تھی۔ اقبال کو مولانا روم کی مثنوی ہست قرآن در زبان پہلوی سے قرآن ہی کی وجہ سے شغف تھا ان کا خیال تھا کہ اگر اس مثنوی کے مطالعے سے قلب میں گرمیٔ شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہیے۔ شوق خود مرشد ہے۔ علامہ کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب انہوں نے کتابوں کا مطالعہ ترک کر دیا اگر کچھ پڑھتے تو صرف قرآن شریف یا مولانا کی مثنوی۔

"بال جبریل" میں پیر و مرید کے تحت جو نظم ملتی ہے اس میں دور حاضر کے

مسلمانوں کو حقایق و معارف سے آگاہ کیا گیا ہے اور تمام مسایل کو پیش کر کے مولانا رومی سے ان کا حل دریافت کیا گیا ہے۔ "ضرب کلیم" میں بھی مولانا رومی کی مثنوی کی اہمیت اور رومی کے تصور عشق کو "رومی" نظم کے عنوان کے تحت پیش کیا گیا

گسستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک
کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک

"جاوید نامہ" میں رومی کا ذکر نہایت ہی احترام کے ساتھ موثر انداز میں ملتا ہے۔ یہاں اقبال رومی کی ہی معیت میں عالم بالا کی سیر کرتا ہے ارواح سے ہمکلام ہوتا ہے اور رومی کی اعانت سے کائنات کے مضمون کو سمجھتا ہے۔ اس کتاب میں ایسے حقایق و معارف بیان کیے گیے ہیں جن کا تعلق عالم بالا یا جہاں دیگر سے ہے۔

آنچہ گفتم از جہاں دیگر است
ایں کتاب از آسمان دیگر است

"جاوید نامے" کے آخری حصے "خطاب بہ جاوید" میں پیر رومی کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

پیر رومی را رفیق راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

زانکہ رومی مغز را داند ز پوست
پاے او محکم فتد در کوے دوست

شرح او کردند او را کس ندید
معنی او چوں غزال از ما رمید

رقص تن از حرف او آموختند
چشم را از رقص جاں بر دوختند

"پیام مشرق" میں رومی کے عشق کو بوعلی سینا کے فلسفے پر ترجیح دی ہے۔

بو علی اندر غبار ناقہ گم
دست رومی پردہ محمل گرفت

ایں فروتر رفت تا گوہر رسید
آں بگرداب چو خس منزل گرفت

حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

"بال جبریل" میں رومی کا ذکر یوں ملتا ہے:

۱۔ صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

۲۔ نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گِل ایران وہی تبریز ہے ساقی

۳۔ اسی کشمکش میں گزری میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

عطار ہو رومی ہو رازی ہو کہ غزالی
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

(ضرب کلیم)

پیر رومی مرشد روشن ضمیر | کاروان عشق و مستی را امیر
از نے آں نے نواز پاک زاد | باز شورے در نہاد من فتاد

(پس چہ باید کرد)

چوں رومی در حرم دادم اذاں من | از و آموختم اسرار جاں من
بدور فتنۂ عصر کہن او | بدور فتنۂ عصر رواں من

(ارمغان حجاز)

مذکورہ بالا اشعار اقبال کی اس عقیدت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے جو وہ رومی کے لیے اپنے دل میں رکھتے تھے۔

فارسی زبان و ادب کے علاوہ کلام اقبال میں مذہبی اعلام و مشاہیر کا ذکر بھی نہایت ہی عقیدت سے ملتا ہے۔ جن مذہبی اعلام و مشاہیر کا ذکر کلام اقبال میں ملتا ہے ان میں محبت اور

عقیدت کی انتہا حضور اکرمؐ کی بارگاہ میں ہی ملتی ہے اقبال کو حضور اکرمؐ کی ذات اقدس سے جو والہانہ عشق ہے اس کا اظہار ان کی فارسی اور اردو شاعری کے ہر دور میں ہوتا رہا۔ اردو میں بانگ درا سے ارمغان حجاز تک اور فارسی میں اسرار رموز سے پس چہ باید کرد اور ارمغان کے حصہ فارسی تک کوئی مجموعہ کلام ایسا نہیں جہاں اس عشق کا جلوہ نظر نہ آتا ہو اس جلوے کے انداز اور رنگ البتہ ہر جگہ ایک جیسے نہیں ہیں [1]

اقبال نے بچپن سے ہی دینی ماحول میں پرورش پائی ان کے والد متقی اور پرہیزگار تھے اس کے علاوہ دین دار اور خدا ترس بھی۔ اس لحاظ سے اقبال کی تربیت ان کے والدین اور اساتذہ نے خاص دینی ماحول میں کی۔ اپنے والد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک صبح جب میں حسب معمول قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا وہ میرے پاس آئے اور فرمایا بیٹا یہ کہنا تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن کریم تم پر اترتا ہے یعنی اللہ تعالی خود تم سے ہم کلام ہے" [2]

اپنے والدین کی تربیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

پھر آرکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنہوں نے محبت کا راز داں مجھکو

نظم والدہ مرحومہ کی یاد میں علامہ لکھتے ہیں:

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر میرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا

---

[1] ۔ سید وقار عظیم   اقبالیات کا مطالعہ لاہور ۱۹۷۷ء ص ۲۱۶

[2] عبدالسلام ندوی   اقبال کامل۔ دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء   ص ۴

اپنے استاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ شمع بارگاہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھکو

اسلام کے مقابلے میں اقبال کو دیگر ادیان ہیچ نظر آتے اور تمام علوم اور فلسفوں کے مقابلے میں اسلام ہی بہترین نظام نظر آیا۔

مرا درس حکیماں درد سر داد
کہ من پروردۂ فیض نگاہم
مے از میخانہ مغرب چشیدم
بجان من کہ درد سر خریدم
نشستم با نکویان فرنگی
ازاں بے سود تر روزے ندیدم

یورپ کی مادہ پرست دنیا نے اقبال کے اس نظریے کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ یہ اور بھی مستحکم ہوگیا اور بقول خود اقبال کے کہ یورپ کے آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔[1] اس کے علاوہ سر عبد القادر کے نام نظم میں اقبال عشق رسول ﷺ کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں:

اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق — سنگ امروز کو آئینہ فردا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہہ عالم میں — خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اسرار خودی میں حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

در دل مومن مقام مصطفیٰ است — آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است
طور موجے از غبار خانہ اش — کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش

رموز بے خودی میں لکھتے ہیں:

1۔ انوار اقبال، مرتبہ، بشیر احمد ڈار، ص ۱۷۶

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید
وز رسالت در تن ما جاں دمید

حرف بے صوت اندریں عالم بدیم
از رسالت مصرع موزوں شدیم

از رسالت در جہاں تکوین ما
از رسالت دین ما آئین ما

از رسالت صد ہزار مالک است
جزو ما از جزو ما لاینفک است

آنکہ شان اوست یہدی من یرید
از رسالت حلقہ گرد ما کشید

پیام مشرق میں لکھتے ہیں:

تنم گلے ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

اس کے علاوہ حضور اکرمؐ کی خدمت میں یوں عرض کرتے ہیں:

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہؐ او پنہاں و تو پیدائے من

اسی طرح مثنوی مسافر اور زبور عجم میں بھی ایسی عقیدت کا اظہار ملتا ہے اس کے علاوہ نظم حضور رسالت مآبؐ میں بھی عقیدت کا اظہار ملتا ہے اسی طرح بانگ درا کی نظم جوابِ شکوہ میں لکھتے ہیں:

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

— یا —

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:
اے باد صبا کملی والے سے جا کے کہیو یہ پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کی دیں بھی گیا اور دنیا بھی

بال جبریل میں یہ شعر ملتے ہیں:

محمد بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی — مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

وہ دانائے سبل ختم رسل مولائے کل جس نے — غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر — وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفٰےؐ سے مجھے — کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

عشق دم جبریل عشق دم مصطفٰیؐ — عشق خدا کا رسولؐ عشق خدا کا کلام

ایک اور جگہ حضور رسالت مآبؐ کے حضور میں کہتے ہیں:

می توانی منکر یزداں شدن — منکر از شان نبیؐ نتواں شدن

بمصطفٰیؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

نظم شفاخانہ حجاز میں کہتے ہیں:

اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں

ارمغان حجاز میں حضور رسالت مآبؐ کے عنوان سے جو فصل شروع ہوتی ہے اس کا آغاز عزت بخاری کے اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

اس فصل کے کچھ اشعار یوں ہیں:

جہاں از عشق و عشق از سینہ تست — سرورش از مے دیرینہ تست

جز ایں چیزے نمی دانم ز جبریل — کہ او یک جوہر از آئینہ تست

بچشم من نگہ آوردہ تست — فروغ لاالہ آوردہ تست

دو چار م کن بہ صبح رانی — شبنم راتاب مہ آوردہ تست

جبیں را پیش غیر اللہ سودیم — چہ گبراں در حضور او سر دودیم

اسی طرح کچھ اشعار یوں ہیں:

تو فرمودی رہ بطحا گرفتیم — وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست

بگوئے تو گداز یک نوا بس — مرا این ابتدا این انتہا بس

خراب جرات آں رند پاکم — خدا را گفت مارا مصطفیٰؐ بس

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اقبال کے کلام میں عشق رسولؐ کا جذبہ نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ نمایاں ہے۔ اقبال رسولؐ کی سیرت کو عقل کی کسوٹی پر جانچنے کی جرات نہ کرتے تھے بلکہ اس معاملے میں وہ ایمان بالغیب کے قایل تھے۔ بس جو حضور فرمایا وہ دین و ایمان اور سر آنکھوں پر۔ اس بارگاہ میں چوں و چرا کی گنجایش ہی نہیں سمعنا واطعنا اطاعت فرمانبرداری اور غلامی یہی ایمان کی دلیل بلکہ بنیاد ہے۔

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است[1]

مذہب کی جن عظیم المرتبت شخصیات کا ذکر کلام اقبال میں ملتا ہے ان میں میر سید علی ہمدانیؒ کا ذکر بھی نہایت اہم ہے۔ چنانچہ "جاوید نامہ" آنسوئے افلاک میں غنی کاشمیری کے علاوہ میر سید علی ہمدانیؒ کا ذکر بھی ملتا ہے۔

شاعر رنگین نوا طاہر غنی — فقر او باطن غنی ظاہر غنی

نغمہ می خواند آں مست مدام — در حضور سید والا مقام

سید السادات سالار عجم — دست او معمار تقدیر امم

---

[1] فقیر سید وحید الدین — روزگار فقیر — حصہ اول — ص ۹۶-۹۷

تا غزالی درس اللہ ہو گرفت ذکر و فکر از دودمان او گرفت
مرشد آں کشور مینو نظیر میر و درویش و سلاطین را مشیر
خطہ را آں شاہ دریا آستین داد علم و صنعت و تہذیب دیں
آفرید آں مرد ایران صغیر با ہنر ہائے غریب و دل پذیر
یک نگاہ او کشاید صد گرہ
خیز و تیرش را بدل راہے بدہ

اقبال شاہ ہمدان کے حضور میں آتے ہی مسئلہ خیر و شر، مسئلہ کشمیر اور مسلہ روح و بدن کا ذکر کرتے ہیں اس کے علاوہ شاہ صاحب سے اقبال کہتے ہیں کہ شیطان کو کس لیے پیدا کیا گیا ہے اگرچہ انسان کو نیکی کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے تو شاہ صاحب جواب دیتے ہیں:

خویش را بر اہرمن باید زدن تو ہمہ تیغ آں ہمہ سنگ فسن
تیز تر شو تا فتد ضرب تو سخت ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت

اقبال کشمیری کی بے عملی غلام پسندی اور خود فراموشی کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

باد صبا بہ اگر بجینوا گذر کنی حرفے ز ما بہ مجلس اقوام باز گوے
دہقان و کشت و جوئے و خیابان فروختند قومے فروختند و چہ ارزان فروختند

علامہ شاہ ہمدان سے ایک سوال کرتے ہیں کہ خراج کس پر جائز ہے اور تخت و تاج کی اصلیت کیا ہے

ما فقیر و حکمران خواہد خراج
چیست اصل اعتبار تخت و تاج

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے شاہ ہمدان کہتے ہیں:

فاش گویم با تو اے والا مقام
باج را جز با دو کس دادن حرام

یا اولی لامرے کہ منکم شان اوست

آیۂ حق حجت و برہان اوست

یا جواں مردے چو صرصر تند خیز

شہر گیرد خویش باز اندر ستیز

روز کین کشور کشا از قاہری

روز صلح از شیوہ ہائے دلبری

می تواں ایران و ہندوستاں خرید

بادشاہی را ز کس نتواں خرید

جام جم را اے جواں باہنر

کس نگیرد از دکان شیشہ گر

در بگیرد مال او جز شیشہ نیست

شیشہ را غیر از شکستن پیشہ نیست

ان مسایل کا حل پیش کر کے علامہ اقبال نے شاہ ہمدان کے تئیں اپنی عقیدت اور احترام کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ اور فلسفہ کی جن عظیم المرتبت شخصیات کا ذکر کلام اقبال میں ملتا ہے ان میں سید جمال الدین افغانی بھی شامل ہیں۔ اقبال نے جمال الدین افغانی کا ذکر نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ اپنے کلام میں کیا ہے۔ کلام اقبال کے علاوہ اقبال کی نثر میں جمال الدین کا ذکر ملتا ہے۔ اقبال نے افغانی کی خدمات کو سراہا ہے اور ان کی تعلیمات سے بھی اثرات قبول کر لیے ہیں۔ جمال الدین کا ذکر کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

"مولانا جمال الدین کی شخصیت کچھ اور ہی تھی۔ قدرت کے طریقے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں مذہبی فکر و عمل کے لحاظ سے ہمارے زمانے کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوتا

ہے۔ جمال الدین دنیائے اسلام کی تمام زبانوں سے واقف تھے۔ ان کی فصاحت و بلاغت دسحر آفرینی و دلیعت تھی۔ ان کی بے چین روح ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک کا سفر کرتی رہی اور اس نے ایران، مصر اور ترکی کے ممتاز ترین افراد کو متاثر کیا۔ ہمارے زمانے کے بعض جلیل القدر علماء جیسے مفتی محمد عبدہ اور نئی پود کے بعض افراد جو آگے چل کر سیاسی قایدین بن گئے۔ جیسے مصر کے زاغلول پاشاہ وغیرہ انہیں کے شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے لکھا کم اور کہا بہت اور اس طریقے سے ان تمام لوگوں کو جنہیں ان کا قرب حاصل ہوا، چھوٹے چھوٹے جمال الدین بنا دیا۔ انہوں نے کبھی نبی یا مجدد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا پھر بھی ہمارے زمانے کے کسی شخص نے روح اسلامی میں اس قدر تڑپ پیدا نہیں کی جس قدر کہ انہوں نے کی تھی۔ ان کی روح اب بھی سرگرم عمل ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کی انتہا کہاں ہوگی۔"[1]

جمال الدین افغانی کا ذکر کرتے ہوئے انگریزی خطبات میں لکھتے ہیں:

"ہمارا فرض ہے کہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سر نو غور کریں یہ غالباً شاہ ولی اللہ دہلوی تھے جنہوں نے سب سے پہلے ایک نئی روح کی بیداری محسوس کی لیکن اس عظیم الشان فریضے کی حقیقی اہمیت اور وسعت کا پورا پورا اندازہ تھا تو جمال الدین کو جو اسلام کی حیات ملی اور حیات ذہنی کی تاریخ میں بڑی گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے انسانوں اور ان کی عادات و خصایل کا خوب خوب تجربہ رکھتے تھے ان کا مطمح نظر بڑا وسیع تھا اس لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ ان کی ذات گرامی ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک جیتا جاگتا رشتہ بن جاتی۔ ان کی ان تھک کوششیں اگر اسی امر پر مرکوز رہیں تو اسلام نے نوع انسان کو جس طرح کے عمل اور ایمان کی تلقین کی ہے۔ اس کی نوعیت کیا ہے تو آج ہم مسلمان اپنے پاؤں پر کہیں زیادہ مضبوطی سے کھڑے ہوتے۔"[2]

---

[1] حرف اقبال۔ لطیف اللہ شیروانی ص ۱۴۹

[2] علامہ اقبال۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ــ ترجمہ نذیر نیازی ص ۱۷۸

جاوید نامہ میں اقبال نے افغانی کا ذکر نہایت ہی عقیدت سے کیا ہے۔ یہاں جمال الدین امامت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں اور سعید حلیم پاشا مقتدی ہیں۔ افغانی سورۃ النجم کی تلاوت فرما رہے ہیں۔ اس تلاوت کا اثر ایسا ہے کہ انبیاء اور ملائکہ پر بھی حالت وجد طاری ہو جاتی ہے۔ اور اس قرأت سے غیب آشکار ہو جاتے ہیں۔

رفتم و دیدم دو مرد اندر قیام — مقتدی تا تار افغانی امام
پیر رومی ہر زماں اندر حضور — طلعتش برتافت از ذوق سرور
گفت مشرق زیں دو کس بہتر نزاد — ناخن شاں عقدہ ہائے ما کشاد
سید السادات مولانا جمال — زندہ از گفتار او رنگ و سفال
ترک سالار آں حلیم دردمند — فکر او مثل مقام او بلند

باچنیں مردان دو رکعت طاعت است
ورنہ آں کارے کہ مزدش جنت است

قرأت آں پیر مرد سخت کوش — سورۃ النجم و آں دشت و خموش
قرأت کز وے خلیل آید بوجد — روح پاک جبرئیل آید بوجد

غزل

حامدی کاشمیری

صد ہا مہ خورشید ہیں اڑتے ہوئے ذرات
اب کیسے کریں ہستیٔ موہوم کا اثبات

اک کالی گراں شب کہ گذرتی ہی نہیں ہے
گھر ہوں کہ ہوں معبد ہے بپا شورِ مناجات

آیات مبیں اگنے لگی ہیں تہہ جاں سے
درپیش ہے شاید سفر وادیٔ ظلمات

وہ تفرقۂ تیرگی و نور کہاں ہے
کس لمس نے پگھلا دیئے نظروں کے حجابات

ہوں حرف کہ انجم ہے انہیں میری ارادت
میں ورنہ بھلا کون ہوں ہے کیا مری اوقات

مشکل ہے بہت گوہرِ مقصود کا ملنا
ہر موج میں غلطیدہ ہیں صد بحرِ طلسمات

غزل

حکیم منظور

ظاہر ہوں تو موجود کی ہوں نفی کہ اثبات
بے چین مجھے کرتے ہیں میرے یہ خیالات
بینا ہو تو اُس آنکھ کی وسعت سے بہت کم
یہ سلسلۂ کارگہِ ارض و سماوات
بو گُل میں شرارے کے تصور سے ہے خالف
عالی کبھی ہو سکتے نہیں اُن کے خیالات
خوش ذوق کے ہاتھوں کی کماں بھی ہیں پسر بھی
بے لُطف ہیں بے ذوق کے تسبیح و مناجات
جو سلسلۂ روز و شب و سال میں ہیں قید
کم تر نہیں کچھ اُن سے نباتات و جمادات
بے رنگ کے سو رنگ ہیں سو رنگ ہیں بے رنگ
یہ عالمِ ظاہر ہے کھُلا ایک طلسمات
نے روح نہ یہ ذہن کی کر سکتے ہیں تہذیب
"احساس مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات"
ہے صاحبِ ادراک کھلا اس پہ یہ نکتہ
منطق ہو کوئی مات کے معنی ہیں فقط مات

اے مردِ قلندر[1] تری توصیف کروں کیا
کیا بات ہے تیری کہ تیری ہی ہے تیری بات
زنگار ہے آئینۂ خوش ذات کا ملبوس
لاتی ہے ہر اک رات نئی صبح کی سوغات
منظور کا اک ذات پہ ایماں ہے برابر
وہ ذات ہے اے قبلۂ حاجات تری ذات

---

[1] ۔ علامہ اقبال

غزل

مشعل سلطانپوری

کیا فکر مری، میرا تخیل، مری اوقات
اقبال کی اس طرح میں اشعار کی سوغات

بارش کی دعا کی تھی ہوئی خون کی برسات
اعمال مرے کیا تھے یہ ہے جن کی مکافات

اقبال نے دیکھا تھا کوئی لالۂ صحرا
دیکھی نہ کسی لالۂ کشمیر کی بارات

مسجد کی اذانوں سے بھی گونج ہے پیدا
کب ختم ہو یہ سلسلۂ مرگِ مفاجات

جذبات کے پھولوں کی پھبن دل کے لہو سے
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اک قطرۂ نیساں پہ آغوشِ صدف تک
جانے ہے وہی جس پہ گزرتے ہوں وہ حالات

شبنم کی طراوت ہو کہ سورج کا اجالا
فطرت کے عنایات ہیں فطرت کے عنایات

تقدیر میں ان کے ہیں مرادیں ہی مرادیں
اور میرے نصیبوں میں ہے ہیہات ہی ہیہات

شاید ہی کوئی دست دعا اور اٹھے گا
ایسے ہی اگر ہوں ترے الطاف و عنایات

غزل

اسد اللہ آفاقی

رقیبوں سے جو سنتے ہو نہیں ہے داستان میری
اگر تابِ شنیدن ہے ذرا! کھولو زبان میری

قفس میں بلبلیں نغمہ سرا ہوتیں نہیں صیّاد
ابھی ہے حسبِ حال اپنے یہی طرزِ فغان میری

عبث ہے میری ڈالی پر یہ کار آشیان بندی
چناروں کا میں پروردہ اور ناری ہے خزاں میری

کسی کا تاج سر ہوں اور کسی کی میں رگ جان ہوں
زمانہ جانتا ہے یہ الگ ہے داستان میری

میرا یہ حُسن فطری بھی مصیبت بن گیا یارو
انا کی جنگ رقیبوں میں ہے مرگِ ناگہاں میری

کٹے سر لالہ و گل ہیں، لٹی، بے آبرو بلبل
مٹا دی ہے چورا ہے پر یہ کس نے آن بان میری

بم و بارود کی بو میں نہائی وادی گلپوش
نظر کس کی لگی وادی یہ تھی رشکِ جناں میری

ورق اس کے اٹھاتا اب نہ لالہ ہے نہ نرگس ہے
یہ حسرت ہے ابھی بکھری پڑی ہے داستان میری

غلام نبی ناظر

طرحی غزل

نشانی ڈھونڈتے ہو دوستو اب تم کہاں میری
"چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری"

عنادل رو رہے ہیں دیکھ لو مدفن پہ پھولوں کے
یہی ارضِ وطن ہے وہ جو تھی رشکِ جناں میری

یہاں بکھرے پڑے افسانے ہیں الفاظ ٹوٹے ہیں
بیاں کرنے چلی تھی وہ کہانی اب زباں میری

چھپے راتوں میں وہ دن بات کرنے کا کہاں یارا؛
مگر اِک بات ہے خاموشی ہے گریہ کناں میری

بجھی شمعیں، گھسے پتھر، یہاں کھنڈر وہاں کھنڈر
سُناتا ہے کہانی اب کے جل کر آشیاں میری

وہ تاریکی کے درپن میں کہ صبحوں کو جگاتی تھی
اٹک کر رہ گئی ہے اب گلے میں وہ اذاں میری

پکاروں اب کِسے آواز دوں چُپ سادھ لی ناظر
ہزاروں سال سے گونجی ہیں خوش الحانیاں میری

غزل

رُخسانہ جبیں

پڑھتے ہیں اسی واسطے ہم نعت و مناجات
ڈر ہے کہ اکیلے میں نہ ہو خود سے ملاقات

تبدیل جنہیں چھوتے ہی ہو جائے تری ذات
ہیں آج بھی زنبیل میں میری وہ نباتات

آئے وہ بشارت بھی کہ جب ہم یہ سنیں گے
احساسِ مروّت نے کچل ڈالے وہ آلات

ہر شخص یہاں ہے ہمہ تن گوش بر آواز
رس گھولنے والی ہے قلندر کی کوئی بات

اللہ کو منظور ہو تو مردِ خود آگاہ
بس ایک جھلک دیکھے تو ہو جائے کرامات

جس سمت سے بھی نکلے، گنے توپ کی مانند
دیکھا ہی نہیں، کون لگاتے ہوئے ہے گھات

وہ جس کی یہاں مر کے بھی قیمت ہے سوا لاکھ
چوکے جو ذرا سا بھی تو مٹی میں ہے اوقات

رانی کا تو یوں چلتا ہے آٹھوں ہی طرف حکم
چلتی نہیں جب چال، پلٹ جاتی ہے بارات

شامت کی گھڑی آئی ہو تو اڑھائی قدم سے
بے جان سے گھوڑے سے بھی کھاتا ہے یہ شہ مات

غزل

نذیر آزاد

رہے گی کب تلک تنہا تمنا نیم جاں میری
کھلے گی روبرو تیرے کسی لمحے زباں میری

توکّل کی ہری پونجی بھی کب کی چھن گئی مجھ سے
بس اک کالی دعا ہے زادِ راہِ امتحاں میری

پلٹ آتی تو کیا غم تھا جھلس کر کھو گئی شاید
حریری خواہش اوڑھے ہوئے آہ و فغاں میری

یہ مانا ہے کسی تاریک گوشے میں پڑی ہو گی
فصیلِ دل سے پر جھانکے گی سعیِ رائیگاں میری

شکستہ پر، سلگتا آشیانہ، چند جھلسے پھول
چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

غزل

محمد یاسین ساگر

اڑا کر لے نہ پھر بادِ صبا بن کر کوئی نکہت
"چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری"

کہاں تم ڈھونڈتے ہو آسماں کے چاند تاروں میں
زمانے کے حوادث میں چھپی ہے داستاں میری

بنا لینا ستاروں میں مگر اِک کہکشاں اپنا
مَن و تو کے بکھیڑوں میں بٹی ہے داستاں میری

کہاں اُسے ڈھونڈ لا کر اب سمیٹوں ورقِ ہستی کے
نشیبوں میں فرازوں میں پڑی ہے داستاں میری

جگر کو چیر کر پڑھنا بہانہ ہے ستمگر کا
جبینوں کی لکیروں میں لکھی ہے داستاں میری

اتارا چاہتا ہے تو نقش کیوں موم کی تہہ پر
کوہستانوں چٹانوں میں سجی ہے داستاں میری

بُھلانا بس میں تیرے ہے نہ میرے شامِ فرقت کی
شفق سی خونِ دل سے جو رنگی ہے داستاں میری

کہاں سے میں شروع کر دوں کہاں پہ میں ختم کر دوں
زمانے کی عمر سے بھی بڑی ہے داستاں میری

طرحی غزل

محمد عبداللہ منتظر

چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری
گراں گذرے گی جو کہنے پہ آئیگی زباں میری

رفیقو غم نہیں مجھ کو ہے لالہ کی جُدائی کا
ابھی تو نرگسیں اور بُلبلیں ہیں راز داں میری

رُلاتی ہے مجھے دن رات گلشن کی یہ ویرانی
ہوئی ہے سرزمینِ لالہ کیوں آتش فشاں میری

نہ جانے کن حسینوں نے اچانک جلوہ دِکھلایا
بہاریں لوٹ آئی ہیں ہوئی رخصت خزاں میری

شبِ غم کے اندھیروں سے نہیں ہم منتظر ڈرتے
ابھی تو گونجتی رہتی منباروں پر اذاں میری

غزل

مُشتاق کشمیری

کسی صورت نہیں جھکتی جبیں پیش بتاں میری
بلند ہوتی رہی ہے تبکدوں میں بھی اذاں میری

بغل میں القرآں میری نظر میں لامکاں میری
جلو داری کو نازل ہو گئے کروبیاں میری

یہ کس شیطاں صفت نے چاندنی میں آگ سلگائی
ہوئی ہے دم کے دم میں راکھ کِشت زعفراں میری

زباں پر ہر کسی کے کلمۂ اللہ اکبر ہے
پڑھا میں نے تو کر ڈالی مُہر برلب زباں میری

بجا ہم لوگ ہیں مدحت سرا اقبال کے لیکن
نہیں ہے ترجماں اُس کی زبان تیری زباں میری

مجھے اِقبال کا نورِ بصیرت عام کرنا ہے
اسی منہاج پر ہے مُرتسم فکرِ جواں میری

کیا تقلید مغرب نے زن مستور کو نازن
زمیں لرزاں، فلک حیراں، دریغا الاماں میری

ہوا ہے فکر دفن حلقہ بگوشِ مصطفےٰؐ امیرا
قلم مومن ہوا ایمان لائی ہے زباں میری

یہ بستی پتھروں کی ہے یہاں ہر آنکھ پتھریلی
بسر ہوتی ہے ان ہی پتھروں کے درمیاں میری

لکھوں کیا آگ آہن، شورِ محشر، سر کٹی لاشیں
چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

بہی ہے آرزو مشتاق کی مولا کہ ہو جائے
ندائے گنبدِ خضریٰ حیاتِ جاوداں میری

وائس چانسلر پروفیسر محمد یاسین قادری اقبال انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات اجرا کرتے ہوئے

یوم اقبال کا ایک منظر

للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالمغنی اقبال کے فکر و فن پر خطبہ دینے کے لیے ڈائس پر تشریف فرما۔ پروفیسر اندرابی صاحب مہمانِ گرامی کا تعارف کرا رہے ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی ایک اور نشست میں علامہ اقبال پر اظہار خیال فرما رہے ہیں۔

یوم اقبال کی تقریب کا ایک منظر — پروفیسر عبدالواحد، پروفیسر عبدالمجید متوادر
پروفیسر نذیر احمد ملک پہلی صف میں دیکھے جا سکتے ہیں

یوم اقبال کا ایک منظر صف اول میں مرزا عارف پروفیسر اے۔ جی مدہوش، پروفیسر مرغوب بانہالی
ڈاکٹر اقبال ناز کی اور پیرزادہ جیلانی صاحب دیکھے جا سکتے ہیں۔ (دائیں سے بائیں)

پروفیسر محمد یاسین قادری، پروفیسر آغا اشرف اور پروفیسر محمد امین اندرابی

۹ نومبر ۱۹۹۹ء یوم اقبال کی تقریب کا ایک منظر

ڈاکٹر شفیقہ رسول "اقبال اور ہیومنزم" پر اپنا مقالہ پیش کر رہی ہیں۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے اہتمام سے منعقدہ محفل مباحثہ میں ایک طالبہ اظہار خیال کر رہی ہے

انٹر کالج مقابلہ بیت بازی میں جناب حکیم منظور، پروفیسر جی. آر. ملک، جناب
اختر محی الدین اور بشیر احمد نحوی انعامات تقسیم کرنے سے پہلے۔

مقابلہ بیت بازی میں کامیاب ٹیم غالب ٹرافی ہاتھ میں لئے ہوئی۔

کہنہ مشق شاعر مرزا عارف بیگ اپنی بذلہ سنجی سے محفل کو زعفران زار بنا رہے ہیں۔

مقابلہ بیت بازی میں جناب اختر محی الدین ایک طالبہ کو توصیفی سند پیش کر رہے ہیں۔

شعبہ اردو کے طلبہ و طالبات ٹرافی لیتے ہوئے فرطِ مسرت سے جھوم رہے ہیں.

مقابلۂ بیت بازی میں کامیاب ٹیم غالب ٹرافی ہاتھ میں لیے۔ پروفیسر جی آر ملک اور حکیم منظور شعبۂ اردو کے طلبہ کے ساتھ۔

IQBALIAT

12

IQBAL INSTITUTE

UNIVERSITY OF KASHMIR
SRINAGAR.